

جاسوسی دنیا نمبر 80

سینکڑوں ہمیشگی

(مکمل ناول)

سیکریٹری کی تلاش

یہ خیال قاسم کے ذہن میں بُری طرح جڑ پکڑ گیا تھا کہ ہر بڑے آدمی کو ایک لیڈی سیکریٹری ضروری رکھنی چاہئے۔ مگر مشکل یہ آپڑی تھی کہ رکھتا کہاں؟ آج کل اس کے والد عاصم صاحب اسے بڑی پابندیوں میں رکھتے تھے اور دیکھ بھال کے فرائض تو اس کی بیوی کے سپرد پہلے ہی سے تھے! وہ اس پر کڑی نظر رکھتی تھی اور قاسم کو اس قد غم پر بے حد تاؤ آتا تھا۔ لیکن دم بخود رہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ اپنے باپ کے غصے کے تصور ہی سے اس کی روح فنا ہوتی تھی۔ بیوی کا منہ اسے دیکھنا ہی پڑتا تھا کہ کہیں پیشانی پر شکن تو نہیں ہے وہ دراصل اس کے باپ سے اس کی شکایتیں کرتی رہتی تھی اور کبھی کبھی ان شکایتوں کے جھکڑ میں سچ مچ قاسم کی ٹانگ الجھ جاتی! عاصم صاحب بوڑھے سہی لیکن قاسم ہی کے باپ تھے۔ اب بڑھاپے نے ان کا حجم قدرے کم کر دیا تھا لیکن پھر بھی ان کا سامنا ہوتے ہی قاسم محسوس کرنے لگتا تھا جیسے ابھی کسی بات پر خفا ہوں گے اور اس کے ہاتھ پیر توڑ کر رکھ دیں گے۔

بیوی بھی جانتی تھی کہ قاسم بس انہیں کے حوالے سے اس کے کنٹرول میں رہ سکتا ہے، لہذا اٹھتے بیٹھتے اسے دہلاتی رہتی تھی۔

قاسم سہار ہتا لیکن کبھی کبھی ذہنی رو بہک ہی جاتی اور وہ سوچنے لگتا کہ یہ بالشت بھر کی منحنی سی عورت خواہ مخواہ اس کی چھاتی پر سوار ہے اور پھر وہ کوئی ایسی اوٹ پٹانگ حرکت کر بیٹھتا کہ پوری کوشی میں بھونچال آجاتا! لیکن شکست بہر حال اسی کی ہوتی۔ جہاں اس کی بیوی فون کی طرف جھپٹی! بس ہوش آگیا۔ گڑگڑاتا ہوا دوڑا اس کے اور فون کے درمیان حائل ہو گیا۔

پر.... دم نکل آئی ہے۔“

بیوی نے سوچا ہنسی پر تو زور نہیں تھا۔ مگر اب کھایا بیا حرام ہو جائے گا۔ لہذا اس نے بڑی چالاکی سے پجویشن بینڈل کی۔

”جب میں خوش ہوتی ہوں تو مجھے ہنسی آ جاتی ہے۔“

”آئے.... ہائے.... کیسی خوشی.... بڑی آئیں خوشی والی۔“ قاسم ہاتھ نچا کر بولا۔

”میں تمہیں دیکھ کر خوش ہوتی ہوں۔“

”قیوں....!“

”اس وقت تم بڑے اچھے لگ رہے تھے.... میں نے کسی فلم میں تمہارا ہی جیسا ایک بادشاہ دیکھا تھا جو بالکل تمہارے ہی جیسے انداز میں اونٹ کی ران چارہا تھا۔“

”اونٹ کی ران....!“ قاسم نے حیرت سے کہا۔ پھر تھوڑی سی حقیقی قسم کی ”ہی ہی ہی“

کے بعد ”اے کیوں مجاہ کرتی ہو.... اونٹ کی ران.... خوب خوب.... ہی ہی ہی۔“

بیوی کو خوش دیکھ کر اس کا موڈ اچانک بالکل ٹھیک ہو گیا۔ بس بھٹکنے والی ذہنی رو ٹھہری۔

”ہاں.... ہاں اونٹ کی ران.... کیونکہ وہ بہت بڑا بادشاہ تھا۔ یہ یاد نہیں کہ چنگیز خان تھا یا بلا کو۔“

”یاد تم بہت اکلند ہو گئی ہو۔ مجھ سے بھی ایک بار ایک فلم ڈائریکٹر نے یہی کہا تھا وہ چاہتا تھا

کہ میں اس کے فلم میں چنگیز خان بن جاؤں.... مگر ابا جان.... ارے باپ رے.... کیا ہوتا اگر

میں اس سالے کی بات مان لیتا۔“

بیوی کو خوش دیکھ کر اچانک قاسم کے ذہن نے پھر قلابازی کھائی اور اسے لیڈی سیکریٹری یاد

آگئی۔ مگر وہ سوچنے لگا کہ بات کس طرح شروع کی جائے۔ آخر کھینی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”مغز.... میں بڑا آدمی نہیں ہوں۔“

”ارے.... یہ آج تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ تم ہر اعتبار سے بڑے آدمی ہو۔ شہر

میں کوئی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

”نہیں.... میں بالکل گھٹیا معلوم ہوتا ہوں۔“

”کیوں....؟“ اس کی بیوی کو شاید سچ سچ حیرت ہوئی تھی۔

”ارے اور کیا....!“ قاسم مردہ سی آواز میں بولا۔ ”میرے سیدی لکریٹری کہاں ہے۔“

مگر لیڈی سیکریٹری والا مسئلہ کیسے حل ہوتا۔ سالی ہرگز نہ مانے گی۔ قاسم سوچتا اگھنٹوں سوچتا ہی رہ جاتا۔ قصہ حقیقتاً یہ تھا کہ نانوتہ کے کیس والی زیبا جیل میں تھی اور قاسم کئی بار اس کی ضمانت کی کوشش کر چکا تھا لیکن اسے ناکامی ہی ہوئی تھی.... وہ چونکہ ملک دشمن سرگرمیوں کے الزام میں گرفتار کی گئی تھی اس لئے اس کی رہائی کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ لیکن قاسم کو کون سمجھاتا! بہر حال جب کرنل فریدی نے اسے ڈانٹ پلائی تو اس نے زیبا کا خیال تو ترک کر دیا لیکن لیڈی سیکریٹری کا خیال بدستور اس کے ذہن کے نیم تاریک گوشوں میں مضطرب رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہمدردانہ انداز میں باس کے سر پر ہاتھ پھیرنا بھی لیڈی سیکریٹری کے فرائض میں داخل ہوتا ہے۔ زیبا نے اُسے کچھ اسی طرح ٹریٹ کیا تھا کہ اسے مامتا اور ”محبت“ دونوں کا مزہ آگیا تھا اور یہ ذہنی لذت اس کے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ ماں بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ بیوی ملی تو بے جوجا جو اس سے دور ہی دور رہتی تھی اور یہ بھی چاہتی تھی کہ وہ اس کے کنٹرول میں رہے۔ لہذا زیبا کا برتاؤ اسے ایک ایسی ذہنی زندگی میں لے گیا تھا، جو اس کے لئے بالکل نئی انوکھی اور لذت انگیز تھی.... بس پھر وہ یہی سمجھنے لگا تھا کہ اب وہ کسی لیڈی سیکریٹری کے بغیر زندہ نہ رہ سکے گا۔

لہذا آج کھانے کی میز پر وہ ایک طرف تو بکرے کی مسلم ران ادھیرتا جا رہا تھا اور دوسری طرف ذہنی طور پر اپنی بیوی کی سات پشتوں کی بھی ٹکا بونی کر رہا تھا۔ ذہنی ہیجان دانٹوں کے افعال سے ہم آہنگ ہو گیا تھا۔ یعنی وہ کسی غصہ میں بھرے ہوئے شیر کی طرح بکرے کی ران پر پلا پڑا تھا۔ طرح طرح کے منہ بن رہے تھے۔ کبھی آنکھیں پھلتیں اور کبھی سکڑ جاتیں.... بھنوں میں آڑھی ترچھی ہو جاتیں.... کبھی ناک پر شکنیں آ جاتی اور کبھی پیشانی پر۔

اچانک اس کی بیوی ہنس پڑی اور وہ دیر سے ہنسی ضبط کئے نوالے چبا رہی تھی۔ لیکن اب قاسم کا حلیہ اتنا مضحکہ خیز ہو گیا تھا کہ سینے میں دیر سے چکرانے والا قہقہہ آزاد ہو گیا۔

”قیوں؟“ قاسم کی آنکھیں نکل پڑیں۔ ران کو دانٹوں سے چھکارا ملا اور اس کے موٹے موٹے ہونٹوں نے دائرے کی شکل اختیار کر لی۔

بیوی کی ہنسی تیز ہو گئی اور قاسم نے اس کو طشت میں بیٹھتے ہوئے خود بھی ”ہی ہی ہی“ شروع کر دی۔ مگر یہ ہنسی نہیں تھی بلکہ جلعے انداز میں بیوی کی ہنسی کی نقل تھی۔

پھر وہ یکھٹ اپنی ”ہی ہی“ میں بریک لگا کر دہلا۔ ”قیوں ہنستی ہو۔ کیا میرے.... ماتھے

اس دلچسپ کہانی کے لئے جاسوسی دنیا کا ناول ”چاندنی کا دھواں“ ملاحظہ فرمائیے۔

”کیا...؟“ بیوی نے استفہامیہ انداز میں پلکیں جھپکائیں۔

”لیڈی سیکریٹری... یہ سالی زبان کھڑ لڑاتی... لکھڑاتی ہے۔“

”اوہ...!“ بیوی نے ایک طویل سانس لی اور کسی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر یک بیک مسکرا کر بولی۔ ”یہ کوئی بڑی بات ہے... رکھ لو ایک لیڈی سیکریٹری۔“

”قیافہ...!“ قاسم بھاڑ سامنے پھاڑ کر رہ گیا اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

”ہاں... ہاں... مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر تم لیڈی سیکریٹری رکھنے کے بعد خود کو بڑا آدمی سمجھ سکو... تو ضرور رکھ لو... تمہاری خوشی میں میری بھی خوشی ہے۔“

”اے... اے کہیں تم مجاہد تو نہیں کر رہے۔“ قاسم کسی جھینپی ہوئی عورت کے سے انداز میں مسکرایا۔

”نہیں سچ سچ میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں۔“

”مم... مگر... اباجان۔“

”ارے ہٹو بھی... انہیں پتہ ہی کیسے چلے گا۔“

”کبھی کبھی آتے تو رہتے ہیں... اگر خبر پڑ گئی تو۔“

”وہ مجھے فون پر اطلاع دیے بغیر کبھی نہیں آتے۔ جب وہ آئیں گے اگر تم گھر پر ہوئے تو میں اسے کہیں چھپا دوں گی۔“

قاسم نے ایک بار پھر اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا لیکن وہ بدستور سنجیدہ رہی اور قاسم کو اس کی آنکھوں میں خلوص کے علاوہ اور کچھ نہ نظر آیا۔

اور پھر اسے مکاری کی سوچھی۔ ادھر ادھر کی غمناک باتیں سوچ سوچ کر نتھنے پھلانے لگا۔ ناک میں سرسراہٹ تو ہونے لگی تھی لیکن آنسو کم بخت تھے کہ نکلے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ آخر بہزار دقت دو موٹے موٹے قطرے اس کی پلکوں میں لرز کر گالوں پر بہہ چلے۔

”ارے ہائیں... یہ کیا... تم رونے کیوں لگے۔“ بیوی نے گھبراہٹ کی ایکٹنگ کی۔

”حق... حق... نہیں...!“ قاسم بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”ارے... واہ... روئیں تمہارے دشمن۔ کیا میری ذات سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے۔“

لجہ ایسا ہمدردانہ تھا کہ سچ سچ قاسم کا دل بھر آیا اور وہ پھوٹ پڑا۔

”ارے... ارے۔“ بیوی جھپاک سے کھڑی ہو گئی۔ مگر اس بار اس نے ہنسی روکنے میں ناکامی کر دیا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ دیدہ دانستہ اس کے چہرے سے نظر ہٹائے ہوئے تھی ہنسی! بھلا وہ کیسے رکتی اگر چہرے پر نظر پڑ جاتی۔

”نہیں...!“ قاسم ہچکیاں لیتا ہوا بولا۔ ”تم سے کیا تکلیف پہنچ... بیچ... بیچ... چے گی... تم...“

”ہاں... یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کہنا چاہئے۔ لیکن اس نے اپنے آخری الفاظ ”تم تو“ ذہن میں ہی رکھے کہ کہیں جملہ بے ربط نہ ہو جائے... تم تو فرشتہ ہو... قاسم نے سوچا... مگر فرشتہ تو مرد ہوتا ہے... یہ سالی ٹھہری عورت۔ پھر کیا کہا جائے... اوہ... واہ... خوب... وہ جلدی سے بولا۔

”تم سے کیا تکلیف پہنچے گی... تم تو فرشتے کی جو رو ہو پ۔“

بیوی کے پیٹ میں قہقہوں نے بھونچال مچا دیا اور وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اوہ... اب چپ بھی رہو... مت روؤ... ٹھہرو میں پانی لاؤں،“ وہ جھینپی ہوئی ڈانگ روم سے باہر آئی اور غراپ سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

پھر جو اس نے پیٹ دبائے ہوئے فرش پر مچل مچل کر ہنسا شروع کیا ہے تو آواز بلند نہ ہونے کی کوشش ہی کے سلسلے میں اس کا دھیان دوسری طرف بٹ سکا اور پیٹ کے درد سے بھی نجات ملی۔ اس کے بعد وہ اٹھ ہی رہی تھی کہ قاسم کی آواز آئی۔

”ارے پانی تو یہیں ہے... میں پے لیتا ہوں... آجاؤ۔“

”وہ پھر بہت زیادہ سنجیدہ بن کر ڈانگ ہال میں داخل ہوئی۔ یہاں قاسم ایک طرف منہ لٹائے چہرے پر پانی کے چھینٹے دے رہا تھا۔

وہ خاموش بیٹھی رہی اور قاسم پھر ران ادھیڑنے میں مشغول ہو گیا۔ لیکن اب اسے تاؤ آئی۔ لگتا ہے رونے پر کہ اس کی وجہ سے خواہ مخواہ اس گفتگو کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

بیوی کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ”تم اپنا دل تھوڑا نہ کرو۔ کسی اچھے اخبار میں لیڈی سیکریٹری کے لئے اشتہار دے دو۔“

”اشتہار... ارے باپ رے۔“ قاسم اچھل پڑا۔

”کیوں...!“

پھر قاسم کو سکتہ سا ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان غیر متوقع عنایات کو کیا سمجھے۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ اس کی بیوی اتنی رحم دل کیوں ثابت ہو رہی تھی۔
 ”اچھا میں اسے اخبار کے دفتر میں بھجوانے جا رہی ہوں۔“ اس نے پرچہ اٹھاتے ہوئے کہا۔
 لیکن قاسم بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کی پلکیں تک نہیں جھپک رہی تھیں۔
 وہ سیدھی اپنے کمرے میں آئی اور دوسرا اشتہار لکھنے لگی۔
 ”ضرورت ہے ایک انتہائی درجہ تجربہ کار لیڈی سیکریٹری کی۔ عمر پچاس سال سے ہرگز کم نہ ہونی چاہئے۔ دیسی عیسائی خاتون کو ترجیح دی جائے گی۔ تنخواہ معقول۔۔۔ مندرجہ ذیل پتہ پر کل شام چار بجے بالمشافہ گفتگو کی جائے۔“

لکھ چکنے کے بعد ایک بار پھر اس پر ہنسی کا دورہ پڑا۔
 دوسرے دن اشتہار شہر کے سب سے زیادہ مقبول روزنامے میں شائع ہو گیا۔ لیکن بیوی نے قاسم کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے دی بلکہ اسے گھر سے باہر قدم ہی نہیں نکالنے دیا تھا اور کچھ اتنی زیادہ مہربان ہو گئی تھی کہ قاسم الجھن میں پڑ گیا۔۔۔ الجھن بھی اس کی تھی کہ اب لیڈی سیکریٹری رکھے یا نہ رکھے۔ جب بیوی ہی اتنا خیال کرنے لگے تو لیڈی سیکریٹری کی کیا ضرورت ہے۔ پھر سوچا چلو پڑی ہی رہے گی کیا بُرا ہے۔ پتہ نہیں پھر کب اس گمبھری کا دماغ سنک جائے۔
 شام کو وہ اسے ساتھ لیکر اپنے اسلم بھائی جان کے بنگلے میں جا پہنچی۔ اس نے اس کا انتظام پہلے ہی کر لیا تھا کہ امیدوار کسی ایسی جگہ بٹھائی جائیں جہاں ان پر قاسم کی نظر نہ پڑ سکے۔
 وہ اسے ایک کمرے میں لائی۔ یہاں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔
 ”دیکھو تم بالکل نہ بولنا۔“ بیوی نے اس سے کہا۔ ”بس جو پسند آجائے اسے دیکھ کر اثبات میں سر ہلا دینا۔ میں سب معاملات طے کر لوں گی۔“

”ہائے۔۔۔ میں تم پر۔۔۔ کر بان۔۔۔ اب میں کبھی تمہارا جی نہیں جلاؤں گا۔ الا قسم۔۔۔ یا اللہ سب کو ایسی ہی فسٹ کلاس بیگم صاحب عطا کر۔۔۔ میں تیرا سو کر یہ ادا کرتا ہوں۔“ قاسم نے چھت کی طرف ہاتھ جوڑے۔

ایک ملازمہ امیدواروں کی فہرست لائی یہ تعداد میں چھ تھیں! قاسم نے ان کے نام دیکھے اور بُرا سا منہ بنایا۔

”ارے۔۔۔ ابا جان نے دیکھ لیا تو۔“

”ہش۔۔۔ تم بھی یونہی رہے۔ ارے ابا جان کو پتہ ہی کیسے چلے گا سنو میں نے ایک ترکہ سوچی ہے۔ اسلم بھائی جان آج کل باہر گئے ہوئے ہیں۔ انہیں کے پتہ پر اشتہار دے دیتے ہیں۔ بھابی کو میں سمجھا لوں گی اور ہم دونوں وہیں چل کر انٹر ویو دیں گے۔“

”الا قسم۔۔۔ بڑی گریٹ ہوا وہ۔۔۔ وا۔۔۔ ایسی بیوی کی میں قدر نہیں کرتا۔ لانت ہے مجھ پر۔“
 قاسم نے جھک کر پیروں سے دونوں چپلیں نکالیں اور ان سے اپنا سر پیٹنے لگا۔
 ”ارے ارے۔۔۔ یہ کیا۔“ بیوی کو بیساختہ ہنسی آگئی۔

”میں اسی قابل ہوں۔“ قاسم نے کہا اور چپلوں سے بدستور سر پیتا رہا۔
 یہ سلسلہ شاید گھنٹوں ختم نہ ہو تا مگر بیوی نے ہاتھ پکڑ لئے۔ چپلیں چھینیں، جو بے عذر چھوڑ دی گئیں۔ قاسم اس وقت ”قربان جاؤں“ کی تصویر بنا ہوا تھا۔
 ”تو پھر میں مضمون بناؤں۔“ بیوی نے پوچھا۔

”ہائے جرور۔۔۔ جرور۔۔۔ یا اللہ ان کا سایہ میرے سر پر ہمیشہ قائم رکھیو۔“ قاسم نے ہاتھ پھیلا کر دعادی۔

وہ پھر منہ دبا کر کمرے سے نکل بھاگی اور تقریباً دس منٹ بعد دوبارہ آئی اور کاغذ کا ایک ٹکڑا قاسم کے ہاتھ میں تھما دیا۔
 وہ مزے لے لے کر پڑھنے لگا۔

”ضرورت ہے ایک ذہین اور چست و چالاک لیڈی سیکریٹری کی۔ عمر میں اور تیس کے درمیان ہونی چاہئے۔ یوریشین کو ترجیح دی جائے گی۔ تنخواہ کا مسئلہ بالمشافہ طے کیا جاسکتا ہے۔ مندرجہ ذیل پتہ پر کل شام کو چار بجے ملے۔“

اس نے پرچہ میز پر رکھ دیا اور متحیرانہ نظروں سے بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔

”تو پھر میں اسے چھپنے کے لئے بھیج دوں۔“ بیوی نے پوچھا۔

”جرور۔۔۔ جرور۔۔۔ ہائے۔۔۔ میں تمہاری کیسے پوجا کروں۔ تم کتنی اچھی ہو۔ یوریشین سیکریٹری ارے۔ میں بہت بڑا آدمی ہو جاؤں گا۔“

”اور میں دیکھ کر کتنی خوش ہوں گی۔“ بیوی نے خوش ہو کر کہا۔

”ارے.... یہ تو سبھی.... مسز ہیں۔ مگر نہیں ایک ہے.... مس بھو.... یا کیا دیکھوں کیا لکھا ہے۔“

”مس ڈھو....!“

قاسم نے اس طرح اپنا سینہ تھام لیا جیسے کسی بل ڈوڑنے لکرماری ہو۔

”مسز سلیمہ.... خان۔“ بیوی نے امیدوار کے نام کا اعلان کیا اور ملازمہ باہر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد ایک معمر عورت داخل ہوئی اور قاسم بہت زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ لیکن اس کی بیوی نے اس سے کچھ سوالات پوچھے اور باہر جا کر انتظار کرنے کو کہا۔

سبھی بوڑھی عورتیں آئی تھیں۔ اعلان ہی پچاس سال کی عورتوں کے لئے کیا گیا تھا جو تھی عورت کے باہر جاتے ہی قاسم بیوی کو پانچویں نام کا اعلان کرنے سے روکتا ہوا بولا.... بنغم.... یہ کیا کھ ہے.... اے سبھی بوڑھی آ رہی ہیں۔“

”میں کیا بتاؤں.... مجھے خود بھی الجھن ہو رہی ہے۔ مگر نہیں دیکھو، ان میں سے ایک مس بھی ہے۔“

”اے تم نے تو صاف لکھ دیا تھا کہ بیس سال کی ہونی چاہئے۔“ قاسم آنکھیں نکال کر بولا۔

”یہی تو غلطی ہوئی تھی کہ عمر کے متعلق کچھ لکھنا بھول گئی تھی۔“

”مجھے یاد ہے.... تم نے لکھا تھا۔“

”غلط یاد ہے....“ بیوی نے جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

”تو پھر گلت ہی ہوگا۔“ قاسم نے مردہ سی آواز میں کہا کیونکہ ابھی ایک ”مس“ کی توقع باقی تھی۔

”ڈھو، پھوپھاٹھو سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس نے سوچا اگر نام بُرا ہوگا تو وہ اسے پیار سے ریلی یا کیٹلی وغیرہ کچھ کہہ لیا کرے گا۔“

پانچویں امیدوار آئی اور وہ بھی واپس گئی.... اب باری تھی مس ڈھو کی۔ قاسم سنبھل کر بیٹھ گیا۔

بیوی نے کہا۔ ”اگر یہ بھی خراب نکلی تو سبھوں کا بھگادوں گی۔ دوسرا اشتہار دیا جائے گا۔ مگر

تم خاموش ہی رہنا۔“

مس ڈھو اندر داخل ہوئی اور قاسم غصے کے مارے اچھل پڑا۔ اس کی کھوپڑی احتجاجاً اتنی

شدت سے بل رہی تھی کہ اس کا پہاڑ سا جسم متزلزل نظر آنے لگا تھا۔ یہ مس ڈھو پستہ قد، فرہ

نام اور سو فیصد کوئلہ فام تھی۔ عمر اس کی بھی چالیس یا پینتالیس سال سے کسی طرح کم نہ تھی۔

جتنی بھی تھی لیکن آواز ایسی تھی جیسے کسی اجازت دیرانے میں کوئل کوک رہی ہو۔

بیوی اس سے گفتگو کرتی رہی اور قاسم انگاروں کے بستر پر لوٹا رہا اسے اس عورت کی دیران

کی مسکراہٹ زہر لگ رہی تھی۔ مسکراہٹ کی دیرانی غالباً بھینگے پن کی وجہ سے تھی۔

دفعاً قاسم بول پڑا۔ ”اے.... پہلے یہ تو بتاؤ تم میری طرف دیکھ رہی ہو یا ان کی طرف“ اس نے بیوی کی طرف اشارہ کیا۔

”میں تو.... میں تو.... اس خوبصورت گلدان کی طرف دیکھ رہی تھی جناب کتنا حسین ہے۔“

”بھینگے سے حسین ہے.... تم جاؤ۔“ قاسم کھڑا ہو کر دھاڑا۔

مس ڈھو بوکھلا کر دو چار قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”اچھا.... اچھا! باہر ٹھہرو.... صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ بیوی جلدی سے بول۔

”میں ابھی آکر فیصلہ سناتی ہوں۔“

مس ڈھو جلدی سے باہر نکل گئی۔

”یہ تم نے کیا کیا۔“ بیوی اس کی طرف مڑی۔

”آئے.... ہائے۔“ قاسم دانت نکال کر اور ناک پر شکنیں ڈال کر ہاتھ نچاتا ہوا بولا۔ ”تو

بڑ کیا یہ کہتا.... آؤ.... آؤ.... کھش آمدید.... میری کھوپڑی پر بیٹھ جاؤ۔“

”خدا کے لئے آہستہ بولئے۔“ بیوی نے کہا۔ میں ان لوگوں کو سمجھا بھجا کر واپس کر دوں گی۔

تم نہیں بیٹھو ورنہ اگر تمہارے منہ سے کوئی الٹی سیدھی بات نکل گئی تو اسلم بھائی جان کی بدنامی ہوگی۔ یہ تمام میں کہتی پھریں گی۔ اس کا تو خیال رکھو کہ ہم نے اس انٹرویو کے لئے دوسرے کا گھر

استعمال کیا ہے۔“

”اچھا.... اچھا.... جاؤ بھگاؤ۔“ قاسم برا سامنے بنا کر بولا۔ ”معلوم نہیں صبح کس صورت

رام کا چہرہ دیکھا تھا۔“

”آئینہ تو نہیں دیکھا تھا۔“ بیوی نے گھبرا کر پوچھا۔

”نہیں.... نہیں جاؤ کھ کاؤ سالیوں کو میرا دل گھبرا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے.... جیسے.... بہت سے کچے کرپلے چبائے ہوں.... اوج۔“

اسے ایک زوردار لپکائی ہوئی.... اور اس کے بعد وہ کھانسنے لگا۔ بیوی باہر جا چکی تھی۔
”قیوں....؟“ قاسم ہمہ تن سوالیہ نشان بن گیا۔

”ارے کیا بتاؤں.... بڑا.... گڑبڑ ہو گیا۔“ وہ ہانپتی ہوئی بولی۔
”کیا ہوا!..“

”سب چلی گئیں.... مگر وہ اڑ گئی ہے.... مس ڈھو۔“

”مس ڈھو....!“ قاسم نے آنکھیں نکالیں اور پھر اٹھتا ہوا بولا۔ ”مار ڈالوں گا سالی کو۔“

کیوں گئی ہے۔ کیا میں اس کے باپ کا نوکر ہوں.... آئے ہائے.... مجاز ہی نہیں ملتے۔ جہاں
حسین ہو تیں تو نہ جانے کیا ہوتا.... یوں.... یوں.... مسکراتی ہے۔“

قاسم نے جلے کئے انداز میں اس کی مسکراہٹ کی نقل اتارنے کی کوشش کی اور خود کارٹوں
بن کر رہ گیا۔ بیوی ایسے مواقع پر ہمیشہ ادھر ادھر دیکھنے لگتی تھی، ورنہ اس کی ہنسی کو موت بھی
روک سکتی۔ مرنے کے بعد بھی دانت ہی نظر آتے۔

”تم سمجھ نہیں۔ اس سے تو اب خوف معلوم ہونے لگا ہے۔ میں کہتی ہوں چپ چاپ اسے
ایک آدھ ماہ کے لئے رکھے لیتے ہیں۔ پھر کوئی الزام لگا کر پتہ کاٹ دیں گے۔“ بیوی نے کہا۔
”مگر قیوں رکھ لیں.... اس کی تو ایسی کی تیسری.... آخر تم ڈرتی کیوں ہو۔ ایک گھونے پرانا
ہو کر رہ جائے گی۔“

”اف فوہ! ارے وہ چچا جان کو جانتی ہے۔ تمہیں بھی پہچانتی ہے۔ دھمکیاں دیتی ہے کہتی ہے
میں عاصم صاحب کو بتاؤں گی کہ صاحب زادے اسی طرح لڑکیوں کو بلایا کرتے ہیں۔“

”ارے باپ رے....“ قاسم بے سدھ سا ہو کر کرسی میں گر گیا۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔
”پھر بولو کیا کہتے ہو.... رکھ لوں ایک ماہ کے لئے۔“

”راخ.... لوغ....!“ قاسم نے پھنسی ہوئی سی آواز میں کہا اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھا
کر ہانپنے لگا۔

پراسرار عورت

کرئل فریدی اور کیپٹن حمید ڈاننگ روم میں شام کی چائے پی رہے تھے۔ حمید خاموش تھا۔

بیوی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔

دفتر ایک ملازم اندر آیا اور ایک وزیٹنگ کارڈ میز پر فریدی کے سامنے رکھ دیا۔

حمید نے سر اٹھا کر نام پڑھا اور بُرا سا منہ بنا کر بڑبڑایا۔

”پھر وہی مس ڈھو.... اگر یہ ڈھو کے آگے پیچھے بھی کچھ لگالے تو کیا حرج ہوگا۔ مس

جوگ.... میرے.... خدا.... آخر یہ کیوں آتی ہے آپ کے پاس۔“

”معلوم کرنے کی کوشش کرو۔“

”آپ نہیں بتائیں گے۔“

”ہرگز نہیں.... ویسے تمہیں اجازت ہے کہ ہماری گفتگو سن سکو۔“

”اس کی مسکراہٹ سے مجھے اختلاج ہوتا ہے۔ ضرورت ہو یا نہ ہو مسکرائے گی ضرور بلکہ

برخیال تو یہ ہے کہ وہ تنہائی میں بھی مسکراتی رہتی ہوگی۔“

ملازم پہلے ہی جا چکا تھا۔ فریدی نے خالی کپ آگے کھسکا کر سگار سلگایا۔

”تو کیا اب مجھے آپ کی سراغ رسی کرنی پڑے گی۔“ حمید نے کہا۔

”ہاں اب تمہاری ٹریننگ کے لئے صرف یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ آج

سے میرا طریق کار قطعی بدل گیا ہے۔ میں جانتا ہوں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہاری

ملاحتیں اسی طرح بروئے کار لائی جاسکتی ہیں۔“

”مثلاً....!“

”معلوم کرو کہ مس ڈھو کیا چاہتی ہے۔“

”آپ کو تو معلوم ہی ہے.... پھر میں کیوں جھک ماروں۔“

”خیر چلو.... تم ہماری گفتگو سن کر اندازہ لگانے کی کوشش کرنا۔“

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کہیں اب اندازہ مجھے ہی نہ لگا بیٹھے! ابھی تک تو میں آپ کو اسٹ

کار ہا ہوں اور یہ میرا دل ہی جانتا ہے کہ اس اسٹنس میں مجھ پر کیا گزری ہے۔ لیکن اب یہ

طریق کار کم از کم ایک ہفتہ تو لیٹ کر غور کرنے دیجئے کہ طریق کار بدلنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔“

”مقصد یہ کہ میں کچھ دن دوسرے کام دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”کاموں کی نوعیت کیا ہوگی۔“

”بکواس مت کرو.... اٹھو....!“

حمید نے پائپ سلگاتے ہوئے اٹھنے کا ارادہ کیا۔ فریدی کمرے سے جا چکا تھا۔ پائپ سلا کر بھی ڈرائنگ روم کی طرف روانہ ہو گیا۔

مس ڈھوضو نے پربراجمان تھی اور فریدی شاید حمید کا منتظر تھا۔

حمید کے پہنچنے ہی اس نے مس ڈھو کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ہاں تو آپ انٹرویو میں گئی تھیں۔ پہلے مس ڈھو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی پھر اس نے کہا۔ ”جی ہاں اور وہ میرے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ ویسے میں درجنوں انٹرویوز سے دوچار ہو چکی ہوں لیکن یہ اپنی نوعیت کا انوکھا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہوں۔“

”خیر مصیبت کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ آپ فی الحال اس انٹرویو کے متعلق بتائیے۔“

”غالباً وہ میاں بیوی تھے۔ بیوی چوبیسی پھر تیلی پستہ قد اور نازک اندام تھی۔ اس نے برخلاف شوہر صاحب پہلا تھے پہاڑ۔ صورت سے پرلے سرے کے احقر اور کامل معلوم ہونے لگے۔ جب میں انٹرویو لے رہی تھی اس وقت نہ جانے کیوں انہیں ایک بیک غصہ آ گیا.... اور پوچھے جناب میں دہل کر رہ گئی تھی۔ بس خواہ مخواہ اٹھنے اور ڈانٹ کر کہا باہر نکل جاؤ.... اس کے بعد بیگم صاحبہ تشریف لائیں۔ دوسری پانچ عورتوں کو تو رخصت کر دیا اور مجھ سے فرمانے لگیں معقول تنخواہ ملے گی۔ ہر طرح کا آرام رہے گا لیکن صاحب تمہیں الگ کرنا چاہیں گے۔ ہو سکتا ہے ابھی باہر نکلیں اور گرجے برتنے لگیں۔ لیکن تم گھبراہٹ فوراً کہہ دینا میں آپ کو بھی پچاؤں ہوں اور آپ کے باپ کو بھی۔ خان بہادر عاصم صاحب سے کہوں گی کہ صاحبزادے اس طرح اشتہار دے کر لڑکیوں کا انتخاب فرمایا کرتے ہیں۔ بیگم صاحبہ کی اس حرکت نے مجھے چکر میں ڈال دیا۔ مگر مجھے فوراً ہی آپ کا خیال آ گیا جناب اور دل کو بڑی تقویت پہنچی۔ میں نے چپ چاپ بیگم صاحبہ سے اتفاق کیا۔ وہ اندر تشریف لے گئیں اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر اطلاع دی کہ صاحب نے اپائنٹمنٹ کر دیا ہے اور مجھے کل سے کوٹھی پر حاضری دینی ہو گی۔“

وہ خاموش ہو کر اپنا ہینڈ بیگ کھولنے لگی۔ حمید آنکھیں نکالے ہوئے اپنی کھوپڑی سنہلا رہا تھا۔ تذکرہ سو فیصدی قاسم اور اس کی بیوی کا تھا۔ مگر ان دونوں سے یا ان کی حماقتوں سے فریدی کو کچھ سرکار۔

مس ڈھو نے ہینڈ بیگ سے ایک تعارفی کارڈ نکال کر فریدی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کوٹھی کا پتہ۔“

فریدی نے کارڈ لے کر تحریر پڑھی اور حمید کی طرف دیکھا۔

”میاں قصہ ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ایک انٹرویو.... یہ لو.... دیکھو قاسم ہی کا پتہ ہے۔“ فریدی نے کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔

یہ قاسم ہی کا پتہ تھا۔ اس لئے حمید کی آنکھوں میں متحیرانہ استفہام اب بھی باقی تھا۔

”اس انٹرویو کا حال تم سن ہی چکے ہو۔“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔ ”اب وہ اشتہار بھی دیکھ لو جو

اس انٹرویو کے لئے شائع ہوا تھا۔“

اس نے ایک الماری کھول کر اخبار نکالا اور دو تین صفحات الٹ کر اسے حمید کی طرف بڑھا دیا۔

حمید نے اشتہار بھی دیکھا اور فریدی کی طرف دیکھ کر پلکیں چھپکائیں۔

”یہ.... محمد اسلم ایڈووکیٹ.... اس کی بیوی کا کوئی رشتہ دار ہے۔“ اس نے کہا۔

”خیر.... تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ اپنی کوٹھی پر امید داروں کو نہیں بلانا چاہتے تھے۔“

”مم.... مگر....!“

”اور کچھ مت کہو۔ کوئی غلطی ہوئی ہے۔ میرا یہی خیال ہے۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔

تھوڑی دیر خاموش رہا پھر کہا۔ ”ایک گھنٹے کے اندر اندر میں اس انٹرویو کی وجہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

”لیکن یہ واقعہ آپ کے علم میں کیوں لایا گیا ہے۔“

”جاؤ.... سات بج رہے ہیں۔“ فریدی نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ آج انہوں

نے شام کی چائے دیر سے پی تھی۔

حمید چپ چاپ اٹھ گیا۔ اپنے بیڈ روم میں آیا اور قاسم کے فون نمبر رنگ کئے۔ دوسری

طرف سے قاسم ہی نے جواب دیا لیکن وہ اس مسئلے پر اس سے گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا لہذا اس نے

بڑی پھرتی سے آواز بدل دی اور یہ آواز کسی عورت کی انتہائی شیریں آواز تھی۔ قاسم کے کانوں

میں اسی کے قول کے مطابق شربت کی بوندیں ٹپک گئی ہوں گی۔

”ورا آپا جان کو بلا دیجئے۔“ حمید نے کہا۔

”قیوں.... ہی ہی.... اچھا اچھا۔“ دوسری طرف سے قاسم کی بوگھلائی ہوئی سی آواز آئی۔

”لاش.... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں حمید بھائی۔“

”ہاں لاش اور اس کے پاس سے قاسم کا وزینگ کارڈر آمد ہوا ہے اور کاغذات سے پتہ چلتا

ہے کہ مرنے والی کا نام مس ڈھو تھا۔“

”یقیناً تھا.... میں اسے جانتی ہوں.... اوہ.... حمید بھائی خدا کے لئے یہاں آجائیے۔“

”تہا آؤں.... یادس پندرہ کاٹشیل ساتھ لانے پڑیں گے۔“

”اف.... فوہ.... کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ اس کی موت کے ذمہ دار ہیں۔ آپ

آئیے تو خدا کے لئے۔“

”کہاں آؤں۔“

”گھر آئیے۔“

”قاسم کو کہیں کھسکا دیجئے۔“

”میں یہی کروں گی.... جلدی سے آجائیے.... حمید بھائی۔ خدا کے لئے۔“

حمید نے بائیں آنکھ دبا کر ریسور رکھ دیا۔

کچھ دیر بعد اس کی ونیس قاسم کی کوٹھی کی طرف جارہی تھی۔

قاسم کو کوچ چچ اس کی بیوی نے کوٹھی سے کہیں اور بھیج دیا تھا۔ حمید نے اس کے چہرے پر

ہوائیاں اڑتی دیکھیں۔

”کیا کہنا چاہتی ہیں آپ۔“ حمید نے خالص آفیسرانہ انداز میں پوچھا۔

”حمید بھائی.... دیکھئے اگر وہ مر گئی ہے تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔“

”آپ نے اسے کب دیکھا تھا۔“

”دو گھنٹہ پہلے وہ ہم سے گفتگو کر رہی تھی۔“

”کہاں....!“

”دیکھئے.... ٹھہریئے.... مجھے شروع سے بتانا پڑے گا۔“

”ضرور بتائیے۔“

”آج کل قاسم صاحب پر لیڈی بیکریٹری کا بھوت سوار ہے۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”جی ہاں دیکھئے بلاتا ہوں.... اے آپا جان۔“

اس نے غالباً ماتھ پیس بند کئے بغیر ہانک لگائی تھی اور پھر شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ خود

اسے آپا جان نہ کہنا چاہئے۔ اس لئے فوراً ہی آواز آئی۔ ”ارے.... لا حول.... ولا کوؤت بنغم....

بنغم.... اے بنغم.... یہ فون پر وہ بلارہی ہیں.... جی.... جی ہاں.... کیا کہہ دوں کون بلارہی ہیں۔“

”رقیہ....!“

”آہائیں.... تم روقیا ہو.... ارے اب تم آتی کیوں نہیں ہو۔ اے بنغم.... روقیا ہیں....

روقیا....“ وہ پھر دہاڑا۔

رقیہ دراصل قاسم کی رشتے میں سالی ہوتی تھی۔ خاصی قبول صورت تھی۔ حمید اسے جانتا تھا

اس لئے اسی کی آڑ لے بیٹھا۔

”ہاں بھائی صاحب۔“ اس نے کہا۔ ”میں آج کل بہت مشغول ہوں۔ ہاں دیکھئے آپ ریسور

آپا جان کو دے کر چپ چاپ کمرے سے چلے جائیے۔ کچھ پرائیویٹ باتیں ہیں۔“

”پرائیویٹ.... ہی ہی ہی.... غچھا غچھا.... میں چلا جاؤں غا.... لا قسم بالکل نہیں سنوں

غا.... ہی ہی ہی....!“

حمید جانتا تھا کہ قاسم سالیوں کے معاملے میں بے حد ”نیاز مند“ واقع ہوا ہے۔ لہذا وہ اس

کمرے سے چلا جائے گا۔

حمید نے جلد ہی اس کی بیوی کی آواز سنی اور بولا۔ ”ہیلو.... میں حمید بول رہا ہوں۔“

”کیا مطلب....!“

”کیا آپ کسی مس ڈھو کو جانتی ہیں۔“

”اوہ.... تو اب آپ ذرا اسی بات کی ٹوہ میں رہنے لگے۔“ قاسم کی بیوی کا لہجہ زہریلا تھا۔

”ہام.... تو آپ اسے جانتی ہیں۔“

”آپ چاہتے کیا ہیں....!“

”ٹھہریئے.... بتاتا ہوں۔ لیکن وہ خبر آپ دونوں کے لئے منحوس ہی ہوگی۔“

”جلدی بات ختم کیجئے۔ مجھے دوسرے کام بھی ہیں۔“

”ہمیں ابھی تھوڑی دیر گذری ایک پستہ قد، فریہ اندام اور قطعی سیاہ قام عورت کی لاش ملی ہے۔“

”معاہدہ برابر“ کرنے کا۔ وہ چند لمحے دروازے میں کھڑا رہا۔ پھر ایک زوردار قہقہہ لگا کر ہلکا ہوا۔ ”آپا جان۔“

”جی بھائی جان۔“ قاسم کی بیوی دوڑی چلی آئی۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور وہ بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ حمید کو قہقہے لگاتے دیکھ کر بوکھلا گئی۔

”ارے سب ٹھیک ہو گیا۔“ حمید نے پُرسرت لہجے میں کہا وہ اب بھی ہنسے جا رہا تھا۔

”ج...!“ وہ بھی ہنس پڑی۔ ”کیا ہوا۔“

”ارے اسے سکتے ہو گیا تھا۔ کرمل نے ابھی بتایا ہے کہ اب ہوش میں آگئی ہے اور آپ لوگوں کے وزٹنگ کارڈ کے متعلق وہی بتایا ہے جو آپ ابھی بتا چکی ہیں۔ یعنی وہ قاسم کی سیکریٹری ہے۔“

”شکر ہے... خدا کا... آپ نے تو جان ہی نکال لی تھی حمید بھائی جان۔“

”اور اب پھر ڈال دی... ہا... ہے نا۔“ حمید نے کہا اور پھر یک یک سنجیدہ ہو کر بولا۔

”آخر اسے سکتے کیوں ہو گیا تھا۔“

”ہو سکتا ہے کہ اعصابی اختلال کی مریضہ ہو۔“ قاسم کی بیوی نے کہا۔

”خدا جانے...!“ حمید بولا۔

اور قاسم کی بیوی اس کی مدارات کے لئے انتظامات کرنے لگی۔ قاسم غائب تھا۔

ایک بار پھر حمید چائے کی میز پر نظر آیا۔ جہاں چائے کے ساتھ اس کی دوسری مرغوب چیزیں بھی تھیں۔ وہ قاسم اور اس کی سیکریٹری کے مستقبل کے بارے میں سوچ سوچ کر ہنستے رہے۔

لیکن ساتھ ہی مس ڈھوا ایک موٹے سے سوالیہ نشان کی شکل میں اس کے ذہن پر مسلط ہو گئی تھی۔ وہ آخر تھی کیا بلا...؟ کیا چاہتی تھی۔ اس کی اور کرمل کی گفتگو سے تو حمید نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ فریدی نے اسے اس انٹرویو میں حصہ لینے پر مجبور کیا تھا...؟ کیوں آخر کیوں...؟ اس مذاق کی اسکیم نے تو قاسم کی بیوی کے ذہن میں جنم لیا تھا؟ پھر فریدی کو اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟

اس کی کہانی

آج حمید نے تنہی کر لیا تھا کہ فریدی کو ”اڑنے“ نہیں دے گا۔ کیونکہ مس ڈھوا اس کے لئے

”وہ ایک لیڈی سیکریٹری رکھنا چاہتے ہیں تاکہ بڑے آدمی معلوم ہو سکیں۔“

”ہوں... تو پھر...!“

”میں نے سوچا کہ یہ بھوت اتر جائے تو بہتر ہے۔“ اس نے کہا اور اشتہار بازی سے لے کر سیکریٹری کے اپائنٹمنٹ تک سب کچھ بتا گئی۔ اس کے بعد کہنے لگی۔ ”بھلا بتائیے۔ میں اس کی موت کی خواہاں کیوں ہونے لگی۔“

”ہو سکتا ہے قاسم نے اس سے چھٹکارہ پانے ہی کے لئے...!“

”نہیں نہیں۔“ وہ ہندیانی انداز میں بولی۔ ”ہر گز نہیں۔ وہ اسے رخصت کر دینے کے بعد۔ میری نظروں کے سامنے ہی رہے ہیں۔“

حمید کچھ سوچنے لگا۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ”ظہریے... میں کرمل سے گفتگو کے بغیر کوئی فیصلہ نہ کر سکوں گا۔ کیا میں آپ کا فون استعمال کر سکتا ہوں۔“

”کچھ کیجئے... جلدی کیجئے ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ حمید بھائی جان... خدا کی پناہ یہ مذاق کتنی مصیبتیں لائے گا... ہائے چچا جان تو زندہ ہی دفن کر دیں گے۔“

”پرواہ مت کیجئے... میں پتہ لگا کر انہیں بھی وہیں پہنچا دوں گا۔“

”اس وقت تو مذاق نہ کیجئے۔“ وہ جھنجھلا گئی۔

حمید اس کمرے میں آیا جہاں فون تھا۔ قاسم کی بیوی کو وہ ہدایت کر آیا تھا کہ وہ وہاں نہ آئے۔ حمید نے کوٹھی کے نمبر رنگ کئے۔ دوسری طرف سے فریدی ہی نے ریسیور اٹھایا تھا۔ حمید نے قاسم کی بیوی کا بیان دہرایا۔

دوسری طرف سے ہلکے سے قہقہے کی آواز آئی اور پھر فریدی نے کہا۔ ”میرا پہلے ہی خیال تھا کہ ضرور کچھ غلطی ہوئی ہے۔ خیر اگر یہ مذاق ہی ہے تو اسے جاری رہنا چاہئے۔ یعنی اسے قاسم کی سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرنا چاہئے۔“

”خاصی تفریح رہے گی۔ کیوں؟“ حمید نے ہنس کر کہا۔

”بہت زیادہ... اور شاید اسی تفریح کے سہارے تم بھی کچھ کر سکو۔“

”دعا کرتا ہوں گا آپ کے لئے۔“ حمید نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس نے فریدی کو یہ نہیں بتایا کہ قاسم کی بیوی سے یہ بات اگلوئی کیسے تھی۔ اب سوال تھا۔

سوان روح بن کر رہ گئی تھی۔ ادھر فریدی کا یہ عالم تھا کہ ہر شام اس سے مس ڈھو کے متعلق رپورٹ ضرور طلب کرتا تھا۔ لیکن رپورٹ؟ اس کے علاوہ اور کوئی رپورٹ نہیں ہوتی تھی کہ قاسم آج کل کس کس انداز سے قلابازیاں کھا رہا ہے اور مس ڈھو اس کے لئے بھی دباں جان بن کر رہ گئی تھی۔ قاسم کی بیوی بے حد خوش نظر آتی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ان دنوں اس کا وزن کی پونڈ بڑھ گیا ہے۔

آج آفس سے واپسی پر حمید اللہ ہی گیا اور فریدی نے کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد کہا۔
”آخر تم اس سلسلے میں کیا معلوم کرنا چاہتے ہو۔“

”یہی کہ مس ڈھو آپ سے کیا چاہتی ہے اور آپ نے اسے قاسم والے انٹرویو کے لئے کیوں بھیجا تھا۔“

”یہ سب کچھ مضحکہ خیز ہے۔“ فریدی مسکرایا۔ ”اسی لئے میں یہ کیس کلی طور پر تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔“

”یعنی مضحکہ خیز کیس اب میرے ہی سپرد کئے جایا کریں گے۔“ حمید براسامہ بنا کر بولا۔

”تم سمجھ نہیں۔ مطلب یہ کہ تمہاری ذہانت اسی وقت پر پرزے نکالتی ہے جب تم مضحکہ خیز حالات سے دوچار ہوتے ہو۔ اس لئے.... یہ کیس تم بہتر طور پر پنہاں کرو گے۔“

”مجھے آپ کی صحت کی فکر ہے جناب....“ حمید آنکھیں نکال کر بولا۔

”کیا مطلب....!“

”اگر آپ نے کیس کلی طور پر میرے سپرد کرنا شروع کر دیا تو پھر آپ کی صحت کا کیا بنے گا.... میں آج کل آپ کو اداس بھی دیکھتا ہوں.... اکثر تنہائی میں ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں.... اور وہ تو میں جانتا ہی ہوں کہ ایک دن یہ پتھر موم ضرور ہو گا اور آپ کو کسی ایسی عورت سے محبت ہوگی جس کی طرف کوئی آنکھ اٹھانے کی ہمت بھی نہ کر سکے گا۔ مگر آخر بیچارے قاسم کی شامت کیوں آئی ہے۔ وہ مجھ سے رو رو کر کہتا ہے حمید بھائی خدا کے لئے اس سیکریٹری سے پیچھا چھڑا دو.... اس سالی نے مجھ سے کوئی پرانی دشمنی نکالی ہے۔ بہلا پھسلا کر اسے سیکریٹری کر لیا۔“

فریدی ہنستا رہا۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔

”کیا تم اسے مضحکہ خیز نہیں سمجھو گے کہ ایک بہت خوبصورت آدمی مس ڈھو سے شادی

رہا چاہتا ہے۔“

”خیر آپ اتنے خوبصورت تو نہیں ہیں۔“ حمید نے بسور کر خشک لہجے میں کہا۔
فریدی کے تیور بدلے لیکن پھر نہ جانے کیوں وہ حمید کے اس ریمارک پر دل کھول کر ہنسا۔
”گندھے.... وہ پریشان ہے۔“

”کون....!“

”مس ڈھو.... اور اس لئے پریشان ہے کہ ایک بہت خوبصورت آدمی کو اس سے محبت ہوگئی ہے اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

”کیا یہ مس ڈھو کوئی کروڑپتی عورت ہے۔“

”ایک ریٹائرڈ نرس ہے! شاید بدقت تمام بسراوقات کر سکتی ہو۔“

”آہا.... تب تو اس کی کوئی مالدار چچی یا خالہ افریقہ کے جنگلوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئی ہوگی اور اب یہ مس ڈھو اس کا ترکہ حاصل کر کے لیڈی ڈھولک کہلائے گی۔“

”فی الحال ایسی کوئی بات میرے سامنے نہیں آئی۔“

”میں کہتا ہوں آخر آپ کیوں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ اس معاملے میں۔“

”اس لئے کہ دلچسپ ہے یہ معاملہ.... وہ اکثر بڑے عجیب و غریب حالات سے دوچار ہوتی رہی ہے۔ ان دنوں پھر اچانک اس کی زندگی میں ناقابل یقین واقعات رونما ہونے لگے ہیں۔“

”مثال کے طور پر۔“

”میرا خیال ہے کہ تم سب کچھ اسی کی زبانی سنو“ فریدی نے کہا اور اس ملازم کی طرف متوجہ ہو گیا جو میز پر چائے لگا رہا تھا۔

حمید نے پھر کچھ نہیں پوچھا۔ اس نے تو ویسے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ آج مس ڈھو سے ضرور الجھے گا۔ قاسم کی بیوی نے آج اسے رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ مقصد غالباً یہی تھا کہ حمید بھی قاسم اور اس سیکریٹری کی تفریحات میں شریک ہو سکے۔

سات بجے قاسم کی بیوی نے اسے فون پر پھر یاد دلایا کہ شام اسے ان کے ساتھ گزارنی ہے۔

پھر وہ بیس منٹ کے اندر ہی اندر قاسم کی کوٹھی میں پہنچ گیا۔

یہاں اچھا خاصہ ہنگامہ برپا تھا۔ قاسم حلق پھاڑ رہا تھا اور اس کی بیوی دور کھڑی ہنس رہی

”حمید بھائی سمجھاؤ....“ قاسم بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

بہر حال حمید نے اس کی بیوی کو سمجھانے کی ایکٹنگ میں کئی منٹ ضائع کئے اور جب وہ فون پر کرنے پر آمادہ ہو گئی تو اس نے مس ڈھوکے متعلق پوچھا۔

”ارے.... تو میری جان جلائے آئے ہو۔“ قاسم آنکھیں نکال کر دھاڑا۔ ”کیا یہ چاہتے ہو کہ وہ ہر وقت میری چھاتی پر سوار رہا کرے۔ میں نہیں جانتا کہاں گئی ہے۔ خدا کرے اسے ہیضہ ہو جائے.... جہاں گئی ہو وہیں رہ جائے۔“

”تم چپ رہو۔ میں نے تم سے نہیں پوچھا۔“ حمید نے خشک لہجے میں کہا اور اس کی بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔

”وہ اپنے کمرے میں ہو گی.... اب رات کو بھی یہیں رہتی ہے۔“ قاسم کی بیوی نے بتایا۔

”نہیں.... تم اب اسے میری کھوپڑی پر باندھ دو.... ہر وقت اٹھائے پھرا کروں گا۔“

قاسم جلے کئے لہجے میں بولا۔

”پھر بہک رہے ہو۔ اٹھاؤں فون۔“ اس کی بیوی نے دھمکی دی۔

”نہیں.... اب جتنا جا.... اٹھاؤ میرا.... ایسی کی تیسری اس فون کی۔ سلا سمجھ میں نہیں آتا قیاقروں.... ابے ابا جان کب مرو گے تم....!“ وہ ہاتھ اٹھا کر چیخا.... مگر شاید یہ جملہ بدحواسی ہی میں زبان سے نکلا تھا۔ کیونکہ اس کے بعد ہی ایسا معلوم ہوا جیسے فرشتہ موت نے اس کی روح قبض کر لی ہو۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ آنکھیں ویران ہو گئیں۔

”کیا کہا تم نے....!“ بیوی آنکھیں نکال کر غرائی۔

”ارے باپ رے۔“ قاسم نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

”گلتی ہو گئی۔ یہ سالی زبان پھسل جاتی ہے۔“ پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”خدا کے لئے مآپھہ کر دو.... میں جہاں کاٹ کر پھینک دوں گا۔ خدا کرے میں مر جاؤں.... ابا جان پر کر بان ہو جاؤں۔“

اس کی بیوی منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ دراصل وہ ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”تم ہی سمجھاؤ.... حمید بھائی۔“ قاسم نے بسور کر اس سے کہا۔

حمید نے سوچا کہ اس وقت وہ قاسم کو ہزاروں گالیاں دے سکتا ہے اس کی پیشانی پر شکن تک نہ آئے گی۔ لہذا کچھ کہنے سے پہلے اسے پوری طرح ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کرنی پڑی۔

تھی۔ لیکن مس ڈھوکہ موجود نہیں تھی۔ حمید کو دیکھ کر قاسم پر گویا ”ذیل“ قسم کے دورے پڑنے لگے۔

”کیوں آپا جان.... کیا بات ہے۔“ حمید نے اس کی بیوی کو مخاطب کیا۔

”ابے پھر جان کہا۔“ قاسم دھاڑا.... ”صرف آپا کہو۔“

”کیا بکواس ہے۔“ قاسم کی بیوی نے کھسیاہٹ اور جھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

”ہائے تو یہ تمہیں جان کہیں۔“ قاسم تاک پر انگلی رکھ کر پلکا۔

”میں کرسی پھینک دوں گی تم پر اگر بکواس کی۔“

”نہیں بلکہ خان بہادر صاحب کو فون کیجئے۔“ حمید نے کہا۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

”اے.... اے.... سنو ٹھہرو۔“ قاسم نے اس کے پیچھے دوڑنے کی کوشش کی مگر وہ تو ویسے بھی رک ہی گئی تھی۔

”کیا ہے۔“

”مم.... مطلب یہ کہ.... سنو تو.... کیا پھانسیدہ....!“

”فائدہ ہو یا نہ ہو.... میں یہ چاہتی ہوں کہ تمہیں ایک آدھ ماہ کے لئے چپ لگ جائے۔“

”لگ جائے گی۔ لگ جائے گی۔ انشاء اللہ۔“ قاسم نے بڑے خلوص سے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ وہ بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ شاید اس کے اس رویہ کا محرک یہ نکتہ بھی ہوا تھا کہ وہی اسے اس جان لیوا سیکریٹری سے بھی نجات دلائے گی۔

کچھ دیر کے لئے کمرے کی فضا پر سکوت طاری ہو گیا۔ لیکن قاسم کی بیوی کے چہرے پر اب بھی غصے کے آثار باقی تھے۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر آپ لوگ ہر وقت لڑتے کیوں رہتے ہیں۔“ حمید نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

”اے.... میں تو بجا کر رہا تھا۔“ قاسم نے دانت نکال دیئے۔

”اور کیا....!“ حمید نے اس کی بیوی کی طرف دیکھ کر ایسے انداز میں کہا جیسے اس کے لئے سفارش کر رہا ہو۔

”نہیں میں تو فون کروں گی۔“

”آپا جان....!“ وہ آخر کار لمبی لمبی سانسیں لے کر بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ قاسم سورہ، چمار ہے، مردود ہے، گدھا ہے اور پتہ نہیں کیا کیا ہے۔ لیکن اس بار معاف کر دو۔ خان بہادر صاحب سے شکایت نہ کرو۔“

”اور کیا....!“ قاسم نے سر ہلا کر کہا۔ ”میں خود ہی کہتا ہوں کہ میں بالکل گدھا ہوں۔“

”آپ کو اعتراف ہے۔“ بیوی نے تیزی سے اس کی طرف مڑ کر پوچھا۔

”ارے.... ہاں.... ہاں اور کتا بھی ہوں۔“ قاسم نے بڑے خلوص سے کہا۔

بیوی بڑی تیزی سے کمرے سے نکل گئی اور حمید پھوٹ پڑا۔

”ہنس لو.... ہنس لو“ قاسم نے دانت نکال کر زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اللہ نے چاہا تو کبھی تم پر بھی گجب نازل ہو گا۔“

”ابے میں نے کیا کیا....!“ حمید نے ہنسنے ہوئے آنکھیں نکالیں۔

”تم قیوں آئے ہو.... قس نے بلایا ہے۔“

”مجھے مس ڈھونے بلایا تھا۔“

”قیوں....؟“

”پتہ نہیں.... شاید وہ مجھ سے عشق کرے گی۔“ حمید نے لاپرواہی سے کہا۔

”ابے.... تم ہوش میں ہو یا نہیں.... یہاں عشق کرو گے۔ میرے گھر میں۔“

”ہاں....!“

”ذرا کر کے تو دیکھو.... میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں.... لاٹ صاحب ہو گے اپنے گھر کے۔“

”تمیز سے بات کرو بیٹا۔ میرے کانوں نے سنا ہے تم نے اپنے باپ کو کو سا تھا۔“

”اچھا قی تھا۔“ قسم اکڑ گیا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم دل سے چاہتے ہو ان کی موت.... نہیں مریں گے تو زہر دلو اور

گے.... میں ابھی انہیں فون پر ہوشیار کئے دیتا ہوں۔“

قاسم ایک بار پھر سنائے میں آگیا۔ ذہنی رو بھر خوف کے راستے پر آگئی اور اس نے کھیانی

ہنسی کے ساتھ کہا۔ ”کیا داکٹی وہ تم سے عی شق کرنے لگی ہے۔“

”میرا یہی خیال ہے۔“

”ارے پیارے بھائی لے جاؤ اسے یہاں سے۔“ قاسم کھٹکھٹایا۔

”پھر تم کیا کرو گے.... تمہیں لیڈی سیکریٹری کی ضرورت ہے۔“

”چچھا چھڑاؤ میرا نہیں تو میں مر جاؤں گا.... ہائے اس گلہری کی بچی نے نہ جانے کیا گھپلا

کر دیا۔“

”اچھی بات ہے.... مجھے مس ڈھونے کے کمرے تک لے چلو میں اسے یہاں سے کھکانے کی

کوشش کروں گا۔“

”چلو....!“ قاسم خوش ہو گیا۔

”مگر ہماری گفتگو چھپ کر سننے کی کوشش مت کرنا۔“

”الا قسم اگر کروں تو رانڈ ہو جاؤں.... رانڈ.... ارے نہیں.... وہ کیا کہتے ہیں.... ٹھیکے

سے کہتے ہوں گے کچھ.... نہیں حمید بھائی نہیں میں بہت دور چلا جاؤں گا کمرے سے۔“

”اور بیوی کو بھی ادھر مت آنے دینا۔“

”ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گا.... جا کر تو دیکھے.... اور نہیں تو کیا۔ میں نہیں ڈر تا اور تا کسی

سے۔“ قاسم حمید کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کھینچنے لگا۔

”مس ڈھونے کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ قاسم اسے وہیں چھوڑ کر واپس آگیا۔ حمید کو یقین تھا

کہ قاسم چھپ کر ان کی گفتگو سننے کی کوشش نہیں کرے گا۔

حمید نے دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی۔

”اوہ.... آپ....!“ مس ڈھونے غالباً حیرت سے کہا اس کے سپاٹ چہرے سے تو جذباتی

تغیر کا اندازہ کرنا قطعی ناممکن تھا۔ لہجے ہی کی بناء پر البتہ کبھی کبھی یہ سوچا جاسکتا تھا کہ وہ بھی

جذبات سے عاری نہیں ہے۔

حمید نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ کھلا ہی رہنے دیا تاکہ کسی کے چھپ کر سننے کا امکان

نہ نہ رہ جائے۔

”تمہارا کیس اب میرے پاس ہے۔“ حمید نے کہا۔

”جی ہاں! مجھے کر تل صاحب نے مطلع کیا تھا۔“

”تفصیل میں تمہاری ہی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔“

مس ڈھو کسی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بولی۔ ”بار بار دہرانے سے بھی الجھن ہوتی ہے کیا کرنا صاحب نے آپ کو نہیں بتایا۔“

”میں نے کہا تھا کہ میں تفصیل تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔“

”ایک ایسا آدمی مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے جو بہت خوبصورت ہے۔ مالدار ہے اور عمر میں مجھ سے چھوٹا ہے۔“

”ابھی اس کی نوبت تو نہیں آئی کہ محکمہ سراغ رسانی شادی بیاہ کرانے کے ادارہ میں تبدیل ہو جائے۔“ حمید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”آپ نہیں سمجھتے۔“ مس ڈھو مسکرائی اور حمید نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔ مس ڈھو نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”آج سے پچیس برس پہلے بھی میں ایسے ہی ایک واقعہ سے دوچار ہو کر نہ جانے کیا کیا بھگت چکی ہوں۔ ان دنوں میں سرکاری ہسپتال میں نرس تھی۔“

وہ پھر خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی اور حمید کو تاؤ آگیا اور اس نے کہا۔

”کیا سرکاری ہسپتال میں نرس ہونے کیلئے بھی کسی پراسرار مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔“

”ٹھہریے! میں بتاتی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں، مگر کپتان صاحب خدارا طنزیہ لہجہ نہ اختیار کیجئے۔ میرے حالات مضحکہ خیز مگر بھیانک ہیں۔ کرنل صاحب کا رویہ تو بے حد ہمدردانہ رہا ہے۔ ایسا شریف پولیس آفیسر آج تک میری نظروں سے نہیں گذرا۔ مجھے بالکل ایسا معلوم ہوا تھا جیسے باپ یا ہمدرد بڑے بھائی سے اپنا رونا رو رہی ہوں.... میں تو ڈرتے ڈرتے ان کے پاس گئی تھی.... میں سمجھتی تھی بڑے خونخوار آدمی ہوں گے مگر میرے خدا.... وہ تو خدا کی رحمت ہیں.... ان کے قریب رہ کر ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے چلپاتی ہوئی دھوپ کے مسافر کو کسی تناور اور گھنے درخت کی چھاؤں نصیب ہو گئی ہو۔“

”مس ڈھو پلیز.... غیر متعلق باتیں نہ چھیڑو تو بہتر ہے۔“ حمید نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

”ہسپتال میں ایک ڈاکٹر تھا جو ان العر تھا صحت مند تھا لیکن اتنی خوفناک شکل والا کہ لوگ مریض بچوں کو اس کے پاس نہیں لے جاتے تھے۔ میں بیان نہیں کر سکتی کہ وہ کتنا بد صورت اور ڈراؤنا تھا۔ شاید اس کا باکمال ہی ہونا وہاں اس کی موجودگی کا باعث بنا تھا۔ ورنہ میڈیکل بورڈ کسی

ایسے آدمی کو رکھنا کب پسند کرتا ہے جسے دیکھ کر ہی مریضوں کی حالت غیر ہو جاتی تھی۔ وہ سرجری کا ماہر تھا۔ نازک سے نازک آپریشن اتنی صفائی سے کرتا کہ عقل دنگ رہ جاتی۔ مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ کبھی اس کا کوئی کیس ناکام رہا ہو۔ مگر وہ چہرے پر نقاب لگائے بغیر آپریشن تھیٹر میں نہیں داخل ہوتا تھا۔ شروع شروع میں ایک بار جب وہ نقاب آپریشن کرتے ہی وقت لگایا کرتا تھا ایک مریضہ اس کی شکل ہی دیکھ کر چیخ مار کر بیہوش ہو گئی تھی تب سے وہ احتیاط برتنے لگا تھا۔ نقاب لگائے بغیر آپریشن تھیٹر میں نہیں داخل ہوتا تھا۔“

مس ڈھو پھر خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔

”تب تو وہ ڈاکٹر آپریشن کرنے سے پہلے کلوروفارم وغیرہ کا جھگڑانہ پالتا رہا ہوگا۔“ حمید نے کہا۔

”میں نہیں سمجھی جناب۔“ وہ چونک پڑی۔

”مطلب یہ کہ ادھر مریض نے جلوہ دیکھا اور ادھر بیہوش۔ پھر کلوروفارم کی ضرورت کہاں باقی رہی۔“

”جی ہاں۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”ہونا تو یہی چاہئے تھا۔ مگر اس واقعہ کے بعد سے اس نے یہ کوشش کی تھی کہ آئندہ اس کا کوئی ایسا مریض جس کا آپریشن ہونا ہو اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ ہاں تو وہ بے حد چڑچڑا تھا۔ سب اس سے نفرت کرتے تھے۔ اسے کوئی بھی دوست بنانا پسند نہیں کرتا تھا۔ عورتیں اس سے دور بھاگتی تھیں۔ میں نے کبھی اس کے ساتھ کوئی عورت نہیں دیکھی۔ نرسیں اس کے قریب جاتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ میں نے کبھی کسی نرس کو نہیں دیکھا کہ اس سے کام کی باتوں کے علاوہ اور کسی قسم کی باتیں کی ہوں وہ عموماً خاموش ہی رہا کرتا تھا۔ کبھی کسی سے غیر ضروری گفتگو کرتا ہوا نہیں دیکھا گیا تھا۔“

”مگر....!“

”ٹھہریے کیپٹن.... اب میں اصل معاملہ کی طرف آرہی ہوں۔ مجھے آپ دیکھ ہی رہے ہیں مجھے بھی کبھی کسی نے منہ نہیں لگایا۔ لوگ میرے منہ پر میری ہنسی اڑاتے ہیں اس لئے مجھے ڈاکٹر ڈوبے سے ہمدردی تھی لیکن مجھے اس سے خوف معلوم ہوتا تھا۔ میں اس سے ڈرتی تھی۔ اس کے سامنے پہنچتے ہی کاٹنے لگتی تھی لیکن اس نے مجھے کبھی اپنے غصے کا شکار نہیں بنایا۔ کبھی میرے لئے چڑچڑاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ خوبصورت نرسوں کو وہ اکثر گالیاں بھی دے بیٹھتا تھا۔ مارنے

ہال والی راہداری میں اس نے قاسم کی آواز سنی۔ شاید وہ کسی کمرے سے چیخ رہا تھا۔ ”ارے خولو... میں بتاؤں سالے کو... خولو... نہیں تو دروازہ توڑ دوں گا... اے بیٹم... میں تمہاری بھی گردن مروڑ دوں گا۔“

حمید نے چلتے چلتے رک کر اس کی بیوی کی طرف دیکھا۔
”کیا بات ہے۔“

”ارے میں نے انہیں کمرے میں بند کر دیا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہو جائے۔ ادھر باہر کے دروازے بند کرادیے ہیں مگر وہ آدمی بھی دروازے توڑ ڈالنے کی دھمکی دے رہا ہے۔“
حمید بڑھتا چلا گیا۔ اس کے پیچھے مس ڈھو، قاسم کی بیوی اور تین ملازم بھی تھے۔ نشست کے کمرے کے ایک دروازے پر باہر سے کوئی زور آزمائی کر رہا تھا۔ پاٹ چرچا رہے تھے۔

”کون ہے...؟“ حمید نے گرج کر پوچھا۔

”مس ڈھو کو باہر نکالو...!“ بھرائی ہوئی سی بھاری آواز آئی۔

حمید مسکرا کر قاسم کی بیوی کی طرف مڑا۔

”آپ قاسم کو احمق سمجھتی ہیں محترمہ...!“ اس نے کہا۔ ”وہ اس وقت کتنی شاندار اینگنگ کر رہا ہے۔“

”اوہ... تو کیا...!“

”مس ڈھو باہر آؤ۔“ باہر سے پھر آواز آئی۔ ”ورنہ ایک ایک کو چن چن کر قتل کر دوں گا۔“
حمید نے ان دونوں کو اشارہ کیا کہ وہ اندر جائیں۔ دونوں چپ چاپ مڑ گئیں۔ ملازمین وہیں موجود رہے۔ حمید نے ملازمین سے چپکے سے کہا۔ ”تم لوگ دروازے کے قریب دیوار سے چپک کر کھڑے ہو جاؤ۔ جیسے ہی دروازہ کھلے اُس پر ٹوٹ پڑنا۔“

ملازموں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”نہیں صاحب۔“ ایک نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے رجب کا حال دیکھا ہے۔ پتہ نہیں

زندہ ہے یا مر گیا۔“

”کیا مطلب...!“

”ہم نے اسے کمپاؤنڈ میں روکنے کی کوشش کی تھی، چاروں لپٹ گئے تھے۔ لیکن اس نے

دوڑتا تھا لیکن مجھ سے کبھی تلخ کلامی نہیں کی۔ مجھ سے گفتگو کرتے وقت اکثر مسکرایا بھی کرتا تھا جو ایک قطعی غیر معمولی حرکت تھی۔ کیونکہ عام طور پر اس کی معمولی گفتگو بھی غضب ناک ہی لہجے میں ہوتی تھی۔“

حمید نے دیکھا کہ وہ مسکرا رہی ہے۔ نہ جانے کیوں اس کی ہڈیاں سلگ کر رہ گئیں اسے اس کی مسکراہٹ ایسی ہی زہر لگتی تھی۔ اس نے فوراً ہی اس کے چہرے سے نظر ہٹائی اور بیان سننا رہا۔
وہ کہہ رہی تھی ”ایک شام میں تھیٹر دیکھنے گئی تھی۔ آغا حشر کا کوئی ڈرامہ اسٹیج کیا جانے والا تھا۔ میں تنہا تھی۔ وہاں ڈاکٹر دو بے سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی ڈرامہ دیکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے مجھے مدعو کیا میں انکار نہ کر سکی۔ لیکن مجھے بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ بھلا سوچنے تو بد صورتوں کے اس جوڑے نے کیا قیامت ڈھائی ہوگی۔“

مس ڈھو بیساختہ ہنس پڑی۔ حمید صرف مسکرایا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر بولی۔ ”ہاں تو جناب۔ لوگ ہمیں دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ پھر میں نے ڈاکٹر کو اداس ہوتے دیکھا۔ وہ بے حد مضطرب ہو گیا تھا۔ ہم نے بڑے بددلی سے ڈرامہ دیکھا۔ لیکن ساتھ ہی میں اپنے خیالات پر خود کو برا بھلا کہتی رہی اور سوچتی رہی کہ مجھے ہر حال میں ان کا دل رکھنا چاہئے سب اس سے نفرت کرتے ہیں شاید وہ اسی توقع پر میری طرف جھک رہا ہے کہ میں بد صورت ہوں مجھے بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ شاید اسے قبول کر لوں۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ حمید کو بھی چونکنا پڑا کیونکہ کوٹھی کے کسی حصہ میں شور ہو رہا تھا۔ حمید اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر کے باہر نکل گیا۔

حمید کی گرفتاری

دروازے سے نکلے ہی وہ کسی سے ٹکرایا اور اس کی چیخ سنی۔ یہ قاسم کی بیوی تھی۔

”حمید بھائی... خدا کے لئے جلدی چلے۔ پتہ نہیں وہ کون ہے۔ اس نے ایک ملازم کو شیخ دیا

اور اب باہر کھڑا لٹکا رہا ہے۔ دوسرے ملازم ڈر کر اندر بھاگ آئے ہیں۔“

حمید ہال کی طرف جھپٹا۔ ادھر ہی سے باہر جانے کا راستہ تھا۔

رجب کو اپنے سر سے اونچا اٹھا کر بیچ دیا تھا جناب۔“

”مس ڈھو....!“ باہر سے پھر آواز آئی۔

”دروازہ کھول دو.... میں دیکھوں گا یہ کون ہے۔“ حمید نے گرج کر کہا۔

”بہتری اسی میں ہے کہ دروازہ کھول دو۔ ورنہ پوری عمارت کھنڈر ہو جائے گی۔“

ایک ملازم ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف بڑھا اور چنجی گرا کر تیزی سے پیچھے ہٹ آیا۔

کمرے میں داخل ہونے والا اتادراز قد تھا کہ اسے سات فٹ اونچے دروازے سے گزرتے

وقت جھکتا بھی پڑا تھا۔

اس کا چہرہ اتنا بھینک تھا کہ اس کے بیان کے لئے الفاظ تلاش کرنے میں بھی دشواری

نہوتی۔ ڈیل ڈول کے معاملہ میں قاسم نے بیس ہی تھا۔ لباس بے حد عجیب.... جو تن پوش بھی تھا

اور عریانی کا مظہر بھی.... جو چیز اس نے جسم کے نچلے حصے پر پہن رکھی تھی ناگوں سے چپک کر

رہ گئی تھی اور ادپری حصے پر چڑے کی جیکٹ تھی۔ سر پر بڑے بالوں والی سفید ٹوپی تھی۔ جسے شاید

سنبھالے رکھنے کے لئے ایک چری۔ تمہ ٹھوری سے گپنیوں تک کسا ہوا تھا۔

”مس ڈھو کو میرے حوالے کر دو۔“ وہ حمید کو گھورتا ہوا بلا۔

حمید کی پلکیں جھپک گئیں۔ اس کی آنکھیں بے حد چمکی تھیں۔ حمید نے محسوس کیا کہ وہ اس

سے آنکھیں نہیں ملا سکتا۔ اور پھر اب اسے احساس ہوا کہ نوکر بھی وہاں سے کھسک چکے ہیں۔

”تم کون ہو۔“ اس نے اپنی آواز میں گرج پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ مگر وہ

صرف کانپ کر رہ گئی۔

”میں کوئی بھی نہیں ہوں.... مس ڈھو کو بلاؤ۔“

”تم چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ! ورنہ بہت بُری طرح پیش آؤں گا۔“ حمید نے کہا اور

محسوس کیا کہ اس کا لہجہ کچھ خوفزدہ سا ہے اور اسے اپنی کمزوری پر تاؤ آگیا۔

”سامنے سے ہٹ جاؤ۔“ خوفناک اجنبی غرایا۔ حمید نے اس کی آنکھوں کی وحشت بڑھتی

ہوئی سی محسوس کی۔ وہ بآسانی کشت و خون کر سکے گا۔ حمید نے اس کے تیور دیکھ کر سوچا اور

دوسرے ہی لمحے میں اس کا ریوالبور کوٹ کی جیب سے باہر آگیا۔

”یہ کیا ہے۔“ خوفناک اجنبی نے پوچھا۔

”پیچھے ہٹو ورنہ گولی مار دوں گا۔“

”مار کر دیکھو....!“ وہ حمید کی طرف جھپٹا اور حمید نے اس کے پیروں پر فائر جھونک

مارا.... اور پھر اتنا زوردار دھماکہ ہوا کہ فائر کی آواز اس میں دب کر رہ گئی۔ حمید کو دھچکا سا لگا اور

وہ بھی پچھلی دیوار سے ٹکرا کر ڈھیر ہو گیا۔ لیکن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت باقی تھی۔ کانوں میں

بیٹیاں سی بج رہی تھیں، شاید یہ دھماکہ کا اثر تھا۔ وہ بڑی تیزی سے دروازے کی طرف ریگ

گیا۔ کیونکہ کمرہ دھوئیں سے بھر گیا تھا اور اب وہ وہاں ٹھہر کر سانس نہیں لے سکتا تھا۔

راہداری میں بھی وہ گھنٹوں ہی کے بل چلتا رہا۔ دھماکہ اس کے اعصاب پر بُری طرح اثر

انداز ہوا تھا کہ وہ فی الحال سیدھا نہ کھڑا ہو سکتا پھر راہداری میں بھی کمرے کا دھواں گھس آیا مگر وہ

اتنا گہرا نہیں تھا کہ سانس لینے میں بہت زیادہ دشواری ہوتی۔

وہ گھنٹوں کے بل ریگلتا رہا۔

راہداری کے سرے پر کوٹھی کے افراد کھڑے اسے خیرت سے دیکھ رہے تھے۔ پھر کسی کو

ایک بیک دھوئیں کا احساس ہوا اور اس نے ”آگ آگ“ چیخنا شروع کر دیا۔

”ارے.... انہیں کمرے سے نکالو۔“ قاسم کی بیوی چیختی اور اس کے بعد حمید کی طرف دوڑ پڑی۔

”کیا ہوا حمید بھائی.... اٹھئے.... کیا آگ لگ گئی ہے۔“

”میں نہیں جانتا۔“ حمید نے کہہ کر اٹھنے کی کوشش کی۔

”پھر.... پھر.... یہ دھواں.... یہ دھماکہ....!“

”میں کچھ نہیں جانتا۔“

وہ بالآخر دیوار کا سہارا لے کر اٹھنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ لیکن اس کے پیر کانپ رہے تھے۔

”وہ.... چلا گیا جناب۔“ ایک نوکر نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

”میں نے اسے گولی مار دی۔“

”میرے.... خدا....!“ قاسم کی بیوی چیخ پڑی۔ اب وہ اور زیادہ سہم گئی تھی۔

اتنے میں قاسم شور مچاتا ہوا راہداری میں داخل ہوا۔

”ارے.... آغ.... آغ.... بھاغو.... سالو.... یہاں کیوں مر رہے ہو۔ ارے او گلہری

جل کر مر جائے گی.... نقلو یہاں سے کتنا دھواں ہے۔“

”قیوں....؟“

”اس نے اسے اٹھا کر بیچ دیا تھا۔“

”ارے تو وہ بے حیا.... کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو گیا ہو گا۔“

”چلو آؤ....!“ حمید دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

کمپاؤنڈ سنان پڑی تھی۔ وہ پھانگ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ کیونکہ رجبا چونک رہی تھی اور پھانگ سے ملحقہ کوٹھری میں رہتا تھا۔

اس نے اسے ایک ڈھیر کی شکل میں زمین پر پڑا دیکھا۔ سانس چل رہی تھی۔ لیکن وہ بیہوش تھا۔ ظاہری چوٹ کہیں نظر نہ آئی۔ زمین پر خون کا ہلکا سا دھبہ بھی نہیں تھا۔ اتنے میں قاسم بھی وہاں پہنچ گیا۔

”اسے اٹھا کر اندر لاؤ قاسم۔ میں فون کرنے جا رہا ہوں۔“

”اٹھاؤں۔“ قاسم نے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں! یہ زندہ ہے! جلدی کرو۔ ورنہ سردی سے اکڑ کر مر ہی جائے گا۔“

حمید دوڑتا ہوا پھر اندر آیا اور دوسروں کی باتوں کا جواب دیے بغیر سیدھا اس کمرے میں چلا آیا جہاں فون تھا۔ بڑی تیزی سے گھر کے نمبر ڈائل کئے۔

فریدی دوسری طرف موجود تھا۔

”قاسم کی کوٹھی میں فوراً پہنچئے.... یہاں ایک لاش ہے۔“

”کس کی....!“

”آپ آئیے.... فون پر میں کچھ نہ بتا سکوں گا۔ مطلب یہ کہ میں کوشش بھی کروں تو واقعات

میں دغمن نہ بنان کر سکوں گا۔ جلد آئیے۔“

”اچھا....!“ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہونے کی آواز آئی۔

اب حمید کو پھر قاسم کی بیوی اور مس ڈھوکا سامنا کرنا پڑا۔

”وہ کون تھا جناب۔“ مس ڈھونے کا پتی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔

”یہ تم ہی بتا سکو گی۔“ حمید آنکھیں نکال کر غرایا۔

”میں کیا جانوں جناب۔“

”آگ نہیں ہے صاحب.... صرف دھواں۔“ پشت سے کسی نے کہا اور قاسم الٹ پڑا۔
”میں دوسری طرف جا کر دیکھ آیا ہوں۔ آگ نہیں ہے۔“ ایک ملازم ہانپتا ہوا کہہ رہا تھا۔
”مگر ڈرائیونگ روم میں خون ہی خون ہے۔ صرف دھواں ہے لاش ہے.... ارے باپ رے۔“
”ارے باپ رے۔“ قاسم نے اچھل کر اس کا آخری جملہ دہرایا اور حمید کی طرف جھپٹتا ہوا بولا۔
”اسے تم کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ میری کوٹھی میں لاش کیسی۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ وہ آہستہ سے ڈرائیونگ روم کی طرف مڑ گیا۔ اب وہ اپنے پیروں میں اتنی سکت محسوس کرنے لگا تھا کہ کچھ دور چل سکے۔

دھوئیں کا حجم بڑھنے سے کثافت کم ہو گئی تھی.... وہ ڈرائیونگ روم میں داخل ہوا۔ یہاں ابھی ہلکا سا دھواں باقی تھا.... لیکن وہ لاش؟

حمید اسے گھورنے لگا۔ وہ کسی چھت سے گرے ہوئے شہتیر کی طرح کمرے کے وسط میں پڑی تھی اور اس پر ایک گول میز لٹی پڑی تھی۔

”اوہ....!“ حمید کی آنکھیں یک بیک حیرت سے پھیل گئیں۔ لاش کا سر کہاں تھا؟

شانوں سے سرگردن سمیت غائب تھا اور شانوں کے درمیانی غار سے گاڑھا گاڑھا خون ابل رہا تھا۔

”ارے.... یہ تو بالکل مر گیا۔ ارے باپ رے۔“ اس نے قاسم کی آواز سنی اور چونک کر مڑا۔

”تم قہر رہے تھے تو میں نے اسے غولی ماری ہے۔“

حمید نے اثبات میں سر ہلادیا اور قاسم نے اس سے بھی زیادہ زور زور سے گردن ہلائی۔ غالباً وہ اس جواب پر جھلا گیا تھا۔

”ابے.... تو باہر لے جا کر ماری ہوتی۔ سارے کمرے کا ستیاناس کر دیا۔“ قاسم دہاڑا۔

”خاموش رہو۔“ حمید نے سخت لہجے میں کہا۔ ”جاؤ یہاں سے۔ کوئی ادھر نہ آئے۔ یہ سرکاری حکم ہے۔“

”ہائے رے سرکاری حکم۔“ قاسم ہاتھ نچا کر بولا۔ ”ابے تم نکل جاؤ میری کوٹھی سے ورنہ

اچھا نہیں ہو گا۔ تم سالے منحوس ہو۔ جہاں جاتے ہو وہاں آسمان سے لاشیں ٹپکتی ہیں۔“

”بیہودگی مت کرو.... میرے ساتھ آؤ۔ پتہ نہیں رجبا زندہ ہے یا مر گیا۔“

”تمہیں یہاں سے لے جانے کا مطالبہ کرنے والا تمہارے لئے اجنبی تو نہیں ہو سکتا۔“

”میں نے اسے دیکھا کب تھا جناب۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”پھر جو آپ کا دل چاہے سمجھئے۔ میں تو نہیں جانتی کہ وہ کون تھا اور مجھے کیوں لے جانا چاہتا تھا۔ وہ ٹھہریے.... کیا وہ بہت خوبصورت آدمی تھا۔“

”بے حد....!“ حید کی مسکراہٹ زہریلی تھی۔

”اور آپ نے اسے مار ڈالا۔“ وہ متحیرانہ انداز میں چیختی۔

”شور مت مچاؤ.... ابھی تمہیں اس ڈرامہ کا مطلب بھی سمجھانا پڑے گا۔“

”میرے خدا۔“

”ابے حید بھائی.... کہاں ہو۔“ عمارت کے کسی گوشے سے قاسم کی آواز آئی اور ساتھ ہی ایک ملازم دروازے میں دکھائی دیا۔

”اوہ.... آؤ۔“ حید نے آواز دی۔ ”اس عورت کے ساتھ رہو۔ یہ بھاگتے نہ پائے۔“

دوسرے ہی لمحے میں ملازم مس ڈھوکے سر پر مسلط تھا۔

حید کمرے سے راہداری میں آیا۔ یہاں قاسم سے ٹڈ بھڑ ہو گئی۔

”ارے حید بھائی۔ میرا کھیاں ہے کہ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں۔“ قاسم نے کہا۔

”اوہ.... اسے تو بھول ہی گیا تھا۔“ حید پھر فون والے کمرے کی طرف پلٹ گیا قاسم اس کے پیچھے تھا۔

اس بار حید نے سول ہسپتال کے نمبر رنگ کر کے ایک ایسوی لینس گاڑی طلب کی اور پھر قاسم کے ساتھ اس کمرے میں آیا جہاں بے ہوش رجا ایک مسمری پر پڑا گہری گہری سانس لے رہا تھا۔

”اوہ.... ہاں.... یہ دونوں پنڈلیاں متورم ہیں۔“ حید نے کہا۔ ”یقیناً پیر بیکار ہو گئے ہیں۔“

”یہ سب قیامو غیا حید بھائی۔“

”ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مگر فساد کی جڑ تمہاری سیکریٹری ہے۔“

”اگر وہ تو موت کی جڑ ہے موت قیام فساد کی کہہ رہے ہو۔ جیل بھجواؤ سالی کو جلدی سے۔“

”میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کر تل صاحب کو فون کیا ہے۔“

”ارے تو وہی قیام قریس گے۔“ قاسم جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ وہ شاید پھر سنک گیا تھا۔

”خاموش رہو۔“

”ابے واہ میرے ہی گھر میں مجھ پر دھونس گانتھتے ہو۔“

”قاسم چلے جاؤ یہاں سے ورنہ کچھ ہو جائے گا۔“

”اب اور قیام ہو جائے گا.... میرے دم نکل آئے گی۔“

اتنے میں فریدی کی آمد کی اطلاع ملی اور حید دوڑتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف چلا گیا۔

فریدی تنہا تھا اور متحیرانہ نظروں سے لاش کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”یہ واقعہ شاید تمہاری موجودگی ہی میں ہوا ہے۔“

”میں نے ہی اس پر گولی چلائی تھی۔“

”تم نے....!“

”جی ہاں....!“ حید نے کہا اور جلدی جلدی اسے سب کچھ بتانے لگا۔ فریدی درمیان میں

اسے ٹوکتا بھی جا رہا تھا۔ بہر حال جب حید خاموش ہوا تو اسے احساس تھا کہ بیان تشفی بخش ہوا

ہے۔ اپنی دانست میں اس نے کوئی تفصیل نہیں چھوڑی تھی۔

فریدی ایک بار پھر لاش پر جھک پڑا اور تھوڑی دیر بعد اس نے حید سے پوچھا۔

”تم نے کس جگہ گولی ماری تھی۔“

”ران میں.... غالباً دائیں ران تھی۔“ حید نے جواب دیا۔

”مگر اس کا سارا جسم بے داغ ہے۔“

”میرا دعویٰ ہے کہ گولی اس کی ران پر پڑی تھی۔ مگر وہ دھماکہ۔“

فریدی براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں حراست میں لے رہا ہوں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”کیا مطلب....!“

”تم اس وقت تک حراست میں رہو گے جب تک کہ اس کا معاملہ صاف نہ ہو جائے۔“

”کیا آپ سنجیدہ ہیں۔“

”قطعاً....!“ فریدی نے کسی قسم کی کمزوری ظاہر کئے بغیر کہا۔

”میں نہیں سمجھ سکتا۔“ حمید کے لہجے میں بھلاہٹ تھی لیکن اس نے جملہ پورا کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

”تم اعتراف کر رہے ہو کہ تم نے اس پر گولی چلائی تھی اور ساتھ ہی کسی دھماکے کی کہانی بھی سناتے ہو۔ اس کا سر گردن سمیت غائب ہے۔ میں دیواروں پر چھچھڑے لپٹے ہوئے دیکھ رہا ہوں جن میں شاید سر کا گودا بھی شامل ہے۔ ایسی صورت میں اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ تم پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ملنے تک حراست میں رہو۔ یہ معاملہ کافی الجھاوے رکھتا ہے.... اس لئے میں مجبور ہوں۔“

”تو اب مجھے سلاخیں نصیب ہوں گی کیوں؟“ حمید کا موڈ بالکل خراب ہو گیا تھا۔

”حمید میں مجبور ہوں۔ کیا تم میری بدنامی کے خواہاں ہو۔“

حمید چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر مسکرایا۔ غالباً اسے فریدی کی دشواریوں کا احساس ہو گیا تھا۔ آج کل جھگڑے میں اس کے دشمنوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔

”مگر اس عورت مس ڈھو کے متعلق کیا خیال ہے۔“

”ناواقفیتکہ وہ اپنی پوزیشن صاف نہ کر دے وہ بھی حراست میں رہے گی۔ اس کے لئے میں طویل مدت کا ریماڈ لوں گا تاکہ ضمانت کا سوال ہی نہ پیدا ہو۔ بس اب فی الحال تم سرکاری معاملات میں مجھ سے کسی قسم کی گفتگو نہیں کرو گے۔ کیونکہ اب تمہاری حیثیت دوسری ہے۔“

”تو کیا معمولی حالات....!“

”میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ابھی تمہارا معاملہ ڈی۔ آئی۔ جی صاحب کے سامنے پیش کر رہا ہوں، جیسا وہ مناسب سمجھیں گے کریں گے۔ میں اپنی ذمہ داری پر تمہیں کسی قسم کی چھوٹ نہیں دے سکوں گا۔“

”چلے یہ تجربہ بھی سہی۔“ حمید نے قہقہہ لگایا۔ ”آج آپ مجھے حراست میں لے رہے ہیں۔“

فریدی بے حد متفکر نظر آ رہا تھا۔ ذرا ہی سی دیر میں قاسم کو بھی اس کا علم ہو گیا کہ حمید حراست میں ہے۔ پہلے تو اسے حیرت ہوئی لیکن پھر اس نے بیوی کو آنکھ مارنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”اے قوی چال ہوگی.... یہ دونوں بڑے کھتر ناخ ہیں۔“

تخیر خیز اطلاع

دوسری شام حمید کو حوالات سے رہائی نصیب ہوئی اور اس کے دل میں سجدہ شکر بجالانے کا خیال تک نہ آیا۔ وہ حوالات ہی کچھ اس قسم کی تھی۔

وہ دن بھر ڈی۔ آئی۔ جی صاحب کی کوشش کے ایک کمرے میں بیٹھا وائیلن بجاتا رہا تھا۔ تقریباً پانچ بجے فریدی پہنچا اور اس نے اطلاع دی کہ اب اس پر سے ساری پابندیاں ہٹائی گئی ہیں اور وہ پھر بدستور اس کیس میں کام کرے گا۔

”یہ بڑا عجیب معاملہ ہے۔“ فریدی نے واپسی پر کہا۔ ”بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

”مگر میری گردن کیسے چھوٹی۔“ حمید نے برا سامنہ بنا کر پوچھا۔

”اس کمرے میں تمہارے ریوالور کی گولی مل گئی ہے وہ مخالف سمت کی دیوار سے ٹکرا کر واپس رہ گئی تھی۔“

”مخالف سمت کی دیوار سے.... کیا مطلب۔“ حمید کا لہجہ متحیرانہ تھا۔

”میرا خیال ہے کہ گولی نشانے ہی پر لگی تھی لیکن اس کی ران سے اپٹ کر نشانے والی دیوار سے جا ٹکرائی تھی۔ دیوار پر نشان موجود ہے۔“

”یا خدا....!“ حمید نے پھر برا سامنہ بنایا۔ ”کیا آپ میری گرفتاری پر اتنے ہی مغموں تھے کہ اب شادی مرگ قسم کی کوئی حرکت ہو گئی ہے۔ اور آپ اس مسرت انگیز ذہنی ہیجان کی وجہ سے اپنے خیالات کو صحیح ترتیب دینے سے قاصر ہیں۔“

”کیا مطلب....!“

”یہی مطلب کہ گولی دیوار سے اپٹ کر اس کی ران پر لگی تھی یا ران سے اپٹ کر دیوار پر۔“

فریدی مسکرایا اور آہستہ سے بولا۔ ”کیا تم سمجھتے ہو کہ میرا دماغ الٹ گیا ہے۔“

”اگر گولی ران سے اپٹ کر دیوار پر لگ سکتی ہے تو سب کچھ ممکن ہے۔“

”تم یقین کر دیا نہ کرو لیکن حقیقت یہی ہے۔“

حمید خاموش ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کسی جسم پر گولی پڑ کر اپٹ جانا بیسویں صدی میں ناممکنات میں سے نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے لباس کے نیچے ہلٹ پروف موجود رہے ہوں۔

”اٹنا ہے۔“

”یعنی...!“

”یہ لاش اسی کی وساطت سے پولیس تک پہنچی تھی۔“

”خیر...!“ فریدی واپسی کے لئے مڑتا ہوا بولا۔ ”میں اس لاش کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا

ہوں جس کا آپ پوسٹ مارٹم کر چکے ہیں۔“

”دفتر تک تکلیف کیجئے... مجھے بعض حیرت انگیز چیزوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ مجھے یحید

خوشی ہو گی کہ اگر ان کے متعلق آپ سے گفتگو کرنے کا موقع نصیب ہو سکے۔“ ڈاکٹر خان نے کہا۔

وہ اس کے آفس میں آئے۔

ڈاکٹر خان فکر مند نظر آ رہا تھا۔ جب وہ اطمینان سے بیٹھ گئے تو اس نے کہا۔

”کمرل میں اب تک سینکڑوں لاشوں کا پوسٹ مارٹم کر چکا ہوں اور اپنے اٹھائیس سالہ

تجربے کی بناء پر کہہ رہا ہوں کہ یہ میرے لئے پہلی لاش تھی۔“

”پہلی لاش سے کیا مراد ہے۔“

”وہ غیر معمولی اعصاب کا آدمی تھا۔“

”اکثر اس قسم کے لوگ ملے ہیں۔“ فریدی نے خشک لہجے میں کہا۔

”آپ میرا مطلب نہیں سمجھتی ہیں۔ اکثر مجھے بھی غیر معمولی اعصاب رکھنے والے افراد

کی لاشیں ملی ہیں۔ لیکن یہ لاش ان سے بھی بہت مختلف تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس کے اعصاب

کی نشوونما غیر فطری طور پر ہوئی تھی۔“

”اوہ...!“ فریدی متفکرانہ انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”کاش مجھے اس کا سر بھی مل سکتا۔“ ڈاکٹر خان بڑبڑایا۔

”کیوں...؟“

”اس سے... شاید اسے سمجھنے میں مدد مل سکتی۔ برین بڑی اہمیت رکھتا ہے۔“

”ہاں میں جانتا ہوں۔ کیا اعصاب پر کسی قسم کے دھماکے کے اثرات بھی ملے ہیں۔“

”یقیناً... میں آپ کو یہی بتانا چاہتا تھا کسی غیر متوقع دھماکے کا جو رد عمل اعصاب پر ہو سکتا

ہے اس قسم کے اثرات بھی ملے ہیں۔ لیکن اس کا سر... ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کا سر کسی

فریدی نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ تم اب بلٹ پروف کے متعلق سوچ رہے ہو۔ لیکن اس کے جسم پر بلٹ پروف نہیں پائے گئے۔“

”میں ایسی فضول باتیں کیسے سوچ سکتا ہوں جبکہ ہمارے لٹرچر میں داستان امیر حمزہ بھی سائنٹیفک کتابیں بھی موجود ہیں۔“

”ہوں...!“ فریدی نے ہونٹ بھیج لئے۔ لیکن حمید بدستور الجھن میں رہا۔

کچھ دیر بعد لیکن پولیس ہسپتال کی کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی۔

”یہاں... کیا ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ڈاکٹر خان سے تھوڑی سی گفتگو کروں گا۔“

حمید نے پھر کچھ نہیں پوچھا۔ دیے پوچھنے کو تو ابھی بہت کچھ تھا۔ ابھی تک اسے مس ڈھو

کے متعلق نہیں معلوم ہو سکا تھا اور پچھلی رات اس کی کہانی بھی ادھوری رہ گئی تھی۔

پولیس ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر خان نے ان کا استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا۔

”کیا آپ کو اطلاع مل گئی تھی۔“ اس نے فریدی سے پوچھا۔

”کیسی اطلاع...!“

”دوسری لاش کی۔“

”دوسری لاش... میں نہیں سمجھا۔“

”ویسی ہی بے سر کی دوسری لاش۔“

”اوہ... تو کیا... دوسری کوئی لاش بھی۔“

”جی ہاں۔ مردہ خانے میں موجود ہے۔ پہلی اور دوسری میں آپ ذرہ برابر بھی فرق نہ پائیں

گے۔ جسامت، لباس اور موت کی نوعیت کے اعتبار سے دونوں یکساں ہیں۔“

فریدی کی پیشانی پر سٹوٹس ابھر آئیں۔ ڈاکٹر خان انہیں مردہ خانے کی طرف لے جا رہا تھا۔

یہاں حمید نے دوسری لاش دیکھی۔ پچھلی لاش کا ناخوشگوار تصور اب بھی اس کے ذہن میں

محفوظ تھا۔ دونوں میں اسے کوئی واضح فرق نہ محسوس ہوا۔

”یہ دوسری لاش کہاں ملی ہے ڈاکٹر۔“ فریدی نے پوچھا۔

”تفصیل سے میں ابھی تک آگاہ نہیں ہو سکا۔ ویسے اس لاش کے سلسلے میں کسی سر جو ف کا

”میں آپ ہی کا منتظر تھا کرئل....!“ میجر محمود نے اسے سگار پیش کرتے ہوئے کہا۔
 ”شکریہ....!“ فریدی نے سگار لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ یہ لاش سر جوزف کے
 توسط سے یہاں پہنچی تھی۔“
 ”جی ہاں اور سر جوزف اس وقت سول ہسپتال میں ہے اور اس پر تھوڑے تھوڑے وقفے سے
 قلب کے دورے پڑ رہے ہیں۔“

”زخمی بھی ہے۔“
 ”جی نہیں.... اس کی کہانی بھی کیپٹن حمید کی کہانی سے مختلف نہیں ہے۔ اس نے خوفزدہ
 ہو کر اس پر فائر کیا تھا لیکن گولی پڑتے ہی ایک دھماکہ ہوا اور بے سر کی لاش پڑی رہی تھی۔
 دوسری لاش غالباً آپ دیکھ چکے ہوں گے اور دونوں میں سر موقوف نہ پایا ہو گا۔“
 فریدی نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔
 ”گولی لگی تھی اس کے جسم پر....!“ حمید نے پوچھا۔
 ”نہیں.... ہمیں تو کوئی ایسا نشان نہیں ملا۔“
 ”اس نے جسم کے کس حصے پر فائر کیا تھا۔“

”سینے پر....! وہ اسے مار ہی ڈالنا چاہتا تھا اس نے اعتراف کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ اسے ذرا سا
 بھی موقع نہیں دینا چاہتا تھا کیونکہ اسے خود اپنی زندگی خطرے میں نظر آئی تھی۔ اس کے خیال
 کے مطابق وہ اسے زندہ نہ چھوڑتا کیونکہ وہ پہلے ہی سے اس کے خون کا پیاسا تھا۔ اب سے پچیس
 سال پہلے بھی اس نے اس پر ایک بار قاتلانہ حملہ کیا تھا۔“
 ”اوہ....!“ فریدی میز پر جھک گیا۔ ”میا وہ اسے پہچانتا تھا۔“
 ”جی ہاں.... اس نے کسی ڈاکٹر دوبے کا نام لیا تھا۔“
 ”کیا....!“ فریدی پھر سیدھا ہو بیٹھا۔

”اب سے بیس سال پہلے یہاں سول ہسپتال میں کوئی ڈاکٹر دوبے تھا۔ مگر سر جوزف کا بیان
 ہے کہ وہ اتنا جسیم اور لمبا ترنگا ہرگز نہیں تھا۔“
 ”پھر اسے ڈاکٹر دوبے کا خیال کیسے آیا تھا۔“
 ”اس کی شکل....!“ میجر محمود بولا۔ ”اس کی شکل ہی دیکھ کر اس پر خوف طاری ہو گیا تھا اور

دھماکے ہی کی وجہ سے غائب ہوا ہو۔ شانوں پر بارود کی کھرٹھ بھی ملی ہے۔“
 ”گلد....!“ حمید نے فریدی کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک دیکھی اور پھر وہ اٹھتا ہوا بولا۔
 ”اچھا ڈاکٹر میں دو ایک دن میں اس مسئلے پر آپ سے بالتفصیل گفتگو کر سکوں گا۔“
 ”مجھے بے حد خوشی ہو گی کرئل۔“ ڈاکٹر خان نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ
 پھر لنکن میں آ بیٹھے۔

”میں آج رات بھر ناچنا چاہتا ہوں۔“ حمید نے کہا۔
 ”میں تمہیں اس سے روکوں گا نہیں۔“ فریدی مسکرایا۔ ”کیونکہ آج تم دن بھر وائیلن
 بجاتے رہے ہو۔“
 حمید کچھ نہ بولا۔ وہ پائپ میں تمباکو بھر رہا تھا۔ دفعتاً اسے مس ڈھویا ڈاگنی اور اس نے اس کے
 متعلق پوچھا۔

”وہ قاسم ہی کی کوٹھی میں نظر بند ہے۔“
 ”یہ کیوں....!“
 ”.....!“
 ”لیکن اگر اس کی وجہ سے قاسم یا اس کے خاندان والوں پر کوئی مصیبت نازل ہوئی تو۔“
 ”اس کی سو فیصدی ذمہ داری مجھ پر ہو گی۔“ فریدی نے کہا۔
 ”کیا آپ اس معاملہ کو عاصم صاحب کے علم میں بھی لائے ہیں۔“
 ”لانا ہی پڑتا۔ عاصم صاحب کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن وہ تم سے ضرور شکاکی ہیں۔ ان
 کا خیال ہے کہ قاسم کو تم ہی خراب کئے رہتے ہو۔“

”میں اسے تباہی سے بچائے رکھتا ہوں۔“ حمید نے کہا۔ لیکن فریدی خاموش ہو گیا تھا۔
 کچھ دیر بعد لنکن کو تواری کی حدود میں داخل ہوئی۔

غالباً فریدی دوسری لاش کے متعلق پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔ کو تواری انچارج ان دنوں میجر
 محمود تھا۔ یہ ایک معمر اور سنجیدہ آدمی تھا اور کرنل فریدی کے مداحوں میں اس کا بھی شمار تھا۔ اس
 نے بالکل اسی انداز میں ان کا استقبال کیا جیسے ان کی آمد کا منتظر ہی رہا ہو۔
 ”میجر.... میں دوسری لاش کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

فائر کرتے دقت بھی اس کے ذہن میں یہ سوال نہیں تھا کہ وہ اتنا لمبا چوڑا اور جسیم کیسے ہو گیا اور نہ اسے یہی یاد آ سکا کہ ڈاکٹر دو بے تو ہیں سال پہلے ہی مرچکا تھا۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ اس نے خوفزدہ ہو جانے کے بعد اضطرابی طور پر فائر کر دیا تھا۔

حمید آہستہ آہستہ اپنی کھوپڑی سہلانے لگا۔

”مجھے سر جوزف سے فور اٹلنا چاہئے۔“ فریدی یک بیک اٹھتا ہوا بولا۔ ”میجر محمود بھی اٹھ گیا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔“

وہ دونوں پھر لنکن میں آ بیٹھے۔ جیسے ہی گاڑی حرکت میں آئی حمید نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یہ کیا چکر ہے۔ پچھلی رات مس ڈھونے مجھے کسی ڈراونی شکل والے ڈاکٹر دو بے کی کہانی سنائی شروع کی تھی لیکن وہ ادھوری ہی رہ گئی تھی۔“

”شدید ترین الجھاوے ہیں حمید صاحب۔ سر جوزف سے گفتگو کے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”تو کیا یہ ڈاکٹر دو بے مر گیا تھا۔“

”ہاں.... تم نے کہاں تک وہ کہانی سنی تھی۔“

”بس یونہی.... کسی ڈاکٹر دو بے کا نام آیا تھا اور مس ڈھو کو اس سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد رات والا ہنگامہ شروع ہو گیا تھا۔ کہانی ادھوری رہی۔“

”مس ڈھو پھر اسی ڈاکٹر کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ وہ بہت ہی ستم رسیدہ آدمی تھا۔ بے حد

مغموم۔ وہ چاہتا تھا کہ مس ڈھو اس سے ہمدردی کی بجائے محبت کرے لیکن وہ کسی طرح بھی اس سے محبت نہ کر سکی۔ ہمدردی ظاہر کرنے کے لئے بھی اسے اپنی نفرت سے جھگڑنا پڑتا تھا۔ آخر

ایک دن تنگ آکر مس ڈھو نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس کی تنہائی کی رفیق تو بن سکتی ہے لیکن

اسے اس سے محبت ہرگز نہ ہو سکے گی۔ اس پر برا فروخت ہو کر اس نے اسے دھمکی دی کہ وہ اسے

مار ڈالے گا اور خود بھی مر جائے گا۔ وہ غصے میں تھا۔ مس ڈھو سہم کر رونے لگی تھی۔ پھر کچھ دیر

بعد وہ بھی رو پڑا تھا اور اس نے اس سے معافی مانگی تھی اور کہا تھا کہ اس کی ہمدردیاں ہی اس کے

لئے بہت ہیں اب وہ اس سے محبت قسم کا کوئی غلط مطالبہ نہیں کرے گا۔ لیکن اچانک اسی رات کو

مس ڈھو کی آنکھ کھلی تو اس نے پوری عمارت کو شعلوں میں گھرا ہوا پایا۔ دونوں الگ الگ کمروں

میں سوتے تھے۔ وہ چیختے لگی۔ ساتھ ہی اسے برابر والے کمرے میں ڈاکٹر دو بے کا قہقہہ سنائی دیا۔ وہ

دیوانوں کی طرح چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ”مس ڈھو! ہم دونوں مر رہے ہیں۔ تمہاری صاف گوئی

ہماری موت کا باعث بنی ہے۔ میرا دل رکھنے ہی کے لئے محبت کا اعتراف کر لیا ہوتا۔ آج میں اپنا

نفرت انگیز وجود ختم کر رہا ہوں لیکن تمہیں۔ ساتھ لئے جا رہا ہوں تاکہ تم دوسری دنیا میں بھی مجھ

سے نہ بھاگ سکو۔ میں تمہیں وہاں بھی ساتھ رکھوں گا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہاں بھی نہ میرے

منہ پر نفرت سے تھوکا جائے۔ چلو ہو سکتا ہے اس صورت میں پھر مجھے تمہاری ہمدردیوں کی

ضرورت محسوس ہو۔ پھر وہ کسی نہ کسی طرح اس جلتے ہوئے مکان سے بچ نکلی تھی، لیکن اس کا

ذیال ہے کہ ڈاکٹر دو بے وہیں جل مرا تھا۔ کیونکہ طے ہے ایک مسخ شدہ لاش بھی برآمد ہوئی تھی

جس کا کچھ حصہ تو بالکل ہی راکھ ہو چکا تھا۔ بہر حال میں سرکاری کاغذات سے ڈاکٹر کی موت کی

تصدیق پہلے ہی کر چکا ہوں.... لیکن اب پھر ڈاکٹر دو بے۔“

فریدی خاموش ہو گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”اسی چیز نے مس ڈھو کو مجبور کیا تھا کہ وہ مجھ

سے ملے۔ جب ایک خوبصورت آدمی نے اس سے شادی کی درخواست کی تو اسے پچھلا واقعہ یاد

آ گیا اور وہ میرے پاس دوڑی آئی۔“

”قدرتی بات ہے۔“ حمید نے سر ہلا کر کہا۔ ”اگر وہ ادھر متوجہ نہ ہوتی تو.... اس صورت

میں حالات کا کیا رخ ہوتا۔“

”سوچو.... اور کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرو۔“ فریدی مسکرایا ”اور یہ تو تمہارا کیس ہے۔“

”میرا دل تو چاہتا ہے کہ اب میں ابائیل کے انڈے بچنا شروع کر دوں۔“

فریدی خاموش ہی رہا۔ وہ بہت زیادہ متفکر تھا۔ پھر حمید نے بھی چپ سا دھلی اور پاپ کے

ہلکے ہلکے کش لیتا رہا۔ وہ بھی اب سر جوزف کی گفتگو نے بغیر اس کیس کے متعلق کچھ سوچنا بھی

نہیں چاہتا تھا۔

تقریباً بیس منٹ بعد کار سول ہسپتال کی کپاؤنڈ میں داخل ہوئی۔ یہاں سر جوزف جیسے مشہور

آدمی تک پہنچنے میں کیا دشواری پیش آ سکتی تھی۔ وہ شہر کا ایک متمول تاجر تھا اور سماجی بھلائی کے

کاموں کے سلسلے میں اکثر و بیشتر اس کا نام سنا جاتا رہتا تھا۔

یہ ایک دبلا پتلا مگر اچھی صحت والا بوڑھا تھا۔ آنکھیں چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی

پڑا تھا.... مقدرات.... اس میں نہ میرا قصور ہے اور نہ ڈاکٹر کا.... میں آج بھی اس کے لئے ہمدردی محسوس کرتا ہوں مگر....!“
وہ خاموش ہو گیا۔

وہی تھا

سر جوزف تنے اب آنکھیں کھول دی تھیں اور پلکیں بھپکائے بغیر چھت کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

دو منٹ گزر گئے لیکن اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ تب فریدی نے کہا۔
”سر جوزف میں منتظر ہوں۔“

سر جوزف چونک پڑا اور اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا جیسے اب وہاں اپنی موجودگی کا احساس ہوا ہو۔

”اوہ.... کرمل معاف کیجئے گا۔ میں ماضی کی تکلیف دہ یادوں میں کھو گیا تھا۔ اب مجھے بیٹھ جانے دیجئے.... لیٹے لیٹے میں وہ کہانی نہ دہرا سکوں کہیں پھر مجھ پر دورہ نہ پڑ جائے۔“
”نہریئے سر جوزف.... اگر دورہ پڑنے کا امکان ہو تو میں فی الحال آپ کی کہانی نہیں سنوں گا۔“

”نہیں.... میں دل کو سنبھالوں گا۔“

”ہرگز نہیں....!“ فریدی مسکرایا۔ ”میں اس قسم کے Risks کبھی نہیں لیتا۔ آپ مجھے صرف اتنا بتا دیجئے کہ اس نے آپ پر کہاں حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔“
”میں آج دو بجے اپنی کوشی کے عقبی پارک میں ایک مختصر سی ریس کورس کے امکانات کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک جھاڑیوں سے اس نے مجھے لٹکایا۔“

”عالباً آپ اپنی دیہی کوشی کی بات کر رہے ہیں۔“

”جی ہاں.... میں وہاں تھا.... زیادہ تر وہیں رہتا ہوں۔ مجھے سکون کی ضرورت ہے۔ قلب کے مریض عموماً تنہائی چاہتے ہیں۔“

”اچھی بات ہے سر جوزف۔“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔ ”میں آپ سے پھر ملوں گا بلکہ بہتر تو یہ

تھیں.... سرانڈے کے چھلکے کی طرح شفاف تھا۔ جیسے ہی فریدی نے اس سے اپنا تعارف کر لیا اس نے لیٹے سے اٹھنے کی کوشش کی۔

”اوہ.... آپ لیٹے رہئے سر جوزف.... آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔“ فریدی نے کہا۔
”اوہ.... کرمل میں بے حد خوش ہوں کہ آپ تشریف لائے ہیں۔ میرے دل میں آپ کی بڑی عزت ہے۔“

”آپ اٹھنے کی زحمت نہ کیجئے میں آپ کو تھوڑی سی تکلیف دینے آیا ہوں۔“

”میں حتی المقدور آپ سے تعاون کروں گا کرمل۔“ سر جوزف کی آواز کانپ رہی تھی۔

”آپ کو یقین ہے کہ وہ ڈاکٹر دو بے ہی تھا۔“

”جس وقت میں نے اضطراری طور پر فائر جھونک مارا تھا مجھے یقین تھا کہ وہ ڈاکٹر دو بے ہی ہے۔ لیکن پھر جب مجھے ہوش آیا تھا اور میں نے بے سر کی وہ لمبی ترنگی لاش دیکھی تو مجھے یکت بیک خیال آیا کہ ڈاکٹر دو بے تو اپنے مکان میں جل مرا تھا۔ پھر میں کیسے یقین کر لیتا کہ وہ ڈاکٹر دو بے ہی رہا ہوگا۔“

”کیوں....؟“

”فرض کیجئے اگر وہ اپنی عبارت ہی میں سوخت نہیں بھی ہوا تھا تو.... اتنا کیم شیم کیسے ہو گیا۔ دیکھئے بات دراصل یہ ہے کہ میں کسی ایسی دوا پر یقین نہیں رکھتا جو جسامت کے ساتھ ہی ساتھ آدمی کا قد بھی بڑھا سکے۔ ڈاکٹر دو بے اوسط درجے کا قدر رکھتا تھا۔ مگر یہ لاش.... آٹھ فٹ سے کسی طرح کم نہیں تھی۔“
”شکل....!“

”ارے شکل ہی کی بناء پر تو میں اسے ڈاکٹر دو بے سمجھا تھا اور وہ مشابہت ایسی ہی تھی کہ اضطراری طور پر میں نے اس پر فائر کر دیا تھا۔“

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ کبھی پہلے بھی ڈاکٹر دو بے سے آپ کا جھگڑا ہوا تھا۔“

سر جوزف نے آنکھیں بند کر لیں، اس کے چہرے پر یک بیک زردی چھا گئی تھی۔

”یہ ایک بڑی بھیانک داستان ہے۔ کرمل.... بڑی بھیانک.... جسے دہراتے ہوئے بھی مجھے خوف محسوس ہوگا۔ مگر میں کیا کرتا.... میں کیا کرتا.... مجھے اس داستان کا ایک کردار بننا ہی

”ارے ہاں.... سنو! پچھلی رات اس واقعہ کا اس پر کیا رد عمل ہوا تھا۔“
 ”میں نہیں محسوس کر سکا۔ ویسے وہ بعد میں بڑی دیر تک بحث کرتی رہی تھی میں اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ اس لاش کے بارے میں کچھ بتائے مگر اس نے اس کی شخصیت سے لاعلمی ظاہر کی تھی۔“
 ”اسے زندہ دیکھا تھا اس نے۔“

”میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ ٹھہریے.... مجھے سوچنے دیجئے.... نہیں کرے میں اس وقت میرے علاوہ اور کوئی موجود نہیں تھا۔ جب میں نے اس پر فائر کیا تھا دونوں عورتوں کو کرے سے ہٹا دینے کے بعد دروازہ کھلوا دیا تھا اور پھر اس کے اندر داخل ہوتے ہی نوکر بھی کھسک گئے تھے۔ نہیں مجھے یقین ہے کہ اس نے اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ مگر آپ نے یہ سوال کیوں اٹھایا ہے۔“

”کچھ نہیں یونہی! یہ مس ڈھو بھی ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آسکی۔“
 ”اور سارا قصور اس کی آنکھوں کا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے داہنی آنکھ سے سمجھنے کی کوشش کی جائے یا بائیں آنکھ سے.... دونوں کو یک بیک سمجھنے کی کوشش کیجئے تو درمیان میں مسکراہٹ کود پڑتی ہے.... خدا قاسم پر رحم کرے.... وہ تو بہت خوش ہو گا کہ چلو پاپ کٹا.... مگر حضرت یہ وہی کوٹھری تو ہے جہاں شیطان قید کیا جاتا ہے۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔

کچھ دیر بعد وہ قاسم کی کوٹھری کی حدود میں داخل ہو رہے تھے۔ آج حمید کو پچانک پرچو کیدار نہیں دکھائی دیا۔ کمپاؤنڈ بھی سنایا تھی۔ لیکن خلاف معمول ہر طرف روشنی نظر آرہی تھی۔ شاید کچھ زائد بلب بھی لگائے گئے تھے۔

برآمدے میں صرف قاسم نے ان کا استقبال کیا۔ لیکن وہ بہت زیادہ غصے میں معلوم ہوتا تھا۔ فریدی سے ہاتھ ملاتے وقت اس نے مسکرانے کی کوشش میں کسی چڑچڑے بندر کی طرح دانت نکالے تھے لیکن جب حمید سے مصافحہ کرنے لگا تھا تو اس کا چہرہ کسی توپ کے دہانے کی طرح خوفناک ہو گیا تھا اور حمید کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس کے نیچے کی ہڈیاں کڑکڑا کر ٹوٹ جائیں گی۔ قاسم انہیں اندر لایا.... ڈرائنگ روم میں اس کی بیوی اور مس ڈھو موجود تھیں۔ مس ڈھو کا چوڑا چکلا چہرہ ستا ہوا سا نظر آرہا تھا اور آنکھیں پر قان زدہ سی معلوم ہو رہی تھیں۔ ہونٹ خشک

ہو گا کہ آپ مجھے خود ہی فون پر آگاہ کر دیجئے گا کہ اب آپ کی صحت بہتر ہے۔“
 ”اچھا.... کر تل.... بہت بہت شکریہ۔ آپ سے زیادہ شریف آفسر آج تک میری نظروں سے نہیں گذرا۔“

فریدی اس سے مصافحہ کر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔
 باہر نکلتے ہی حمید نے کہہ۔ ”اور مجھ سے زیادہ کمینہ احمق آج تک روئے زمین پر پیدا ہی نہیں ہوا۔“
 ”میں اسی لئے آپ کی بڑی قدر کرتا ہوں کیپٹن حمید کہ آپ اپنے متعلق بڑی صحیح رائے رکھتے ہیں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔
 حمید بڑا سامنے بنائے ہوئے گاڑی میں جا بیٹھا۔ لیکن پھر چل پڑی۔

”کیوں....؟“ فریدی نے اسے چھیڑا۔ ”تمہارا چہرہ جیومیٹری کی کتاب کیوں بن گیا ہے۔“
 ”ہے نا کتابی چہرہ....!“ حمید نے خوش ہو کر پوچھا۔
 ”بہت زیادہ.... مگر تم بور کیوں ہو رہے ہو۔“
 ”پتہ نہیں وہ کتنی سنسنی خیز کہانی سناتا۔ لیکن آپ نے اسے خواہ مخواہ بخش دیا۔“
 ”فی الحال کوئی کہانی میرے کام نہیں آسکتی۔ میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر دوب، واقعی جل مرا تھا۔“

”پھر بھی آپ نے سر جوزف کو مہلت کیوں دی۔“
 ”سنو! وہ دل کا مریض ہے۔ بہت زیادہ ناخوشگوار اثرات اسے ختم بھی کر سکتے ہیں۔“
 حمید پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا اور شہر کی سڑکیں جگمگانے لگی تھیں۔ حمید نے پائپ سلگایا اور پشت گاہ سے ٹک گیا۔ سردی بڑھ گئی تھی اور وہ گرما گرم کافی کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔

”اب ہم کہاں چل رہے ہیں۔“ اس نے پوچھا۔
 ”ارے.... کیا تمہیں علم نہیں ہے کہ قاسم نے آج ہم دونوں کو رات کے کھانے پر مدعو کیا ہے۔“
 ”ہام....!“ حمید نے دھوئیں سے سینہ صاف کر کے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ ”تو اب شائد مس ڈھو کا چکر ہے۔“

ہوئے اور.... اب.... قرنل صاحب.... ہی ہی ہی۔“

”ہاں.... ہاں بھلا دیکھو تو.... مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہوں نے اسے یہاں کیوں

رکھ چھوڑا ہے۔“ حمید نے قاسم سے ہمدردی جتانے کی کوشش کی۔

”سب تمہاری حرکت ہے۔ میں کھوپ سمجھتا ہوں۔“

”ابے میں نے کیا.... کیا ہے.... مگر ٹھہرو۔ آج تم ہماری دعوت کیوں کر بیٹھے ہو۔ کیا کل

کی دعوت سے جی نہیں بھرا تھا۔“

”اے.... حمید بھائی کل تو ساری رات بھوکوں مر گیا تھا۔“ قاسم کراہ کر بولا۔ ”وہ سالہ....“

ٹھائیں ٹھائیں والا گھپلا ہو گیا تھا نا! بیغم سالی کہنے لگی.... مجھے کھانے پینے کا ہوش نہیں ہے....

ہائے مگر حمید بھائی مجھے تو تھا سالا ہوش ووش۔ مفر خانا نہیں ملا.... ارے باپ رے.... رات بھر

پیٹ میں.... غوں.... غوں.... ہوتی رہی۔“

”میں پوچھ رہا تھا کہ آج تم نے ہمیں دعوت کیوں دی ہے۔“

”قسم خاتا ہوں میں نے نہیں دی دعوت و دعوت.... کرنل صاحب نے خود ہی لی ہے۔ کہنے

لگے فون پر کہ آج تمہارے گھر ہماری دعوت ہے.... بھلا بتاؤ میں کیا چاہتا.... بے حیائی لا کر کہہ

”دیا۔ اچھا صاحب ہے دعوت۔“

”کیا آج کسی نے یہاں مس ڈھوسے ملنے کی کوشش کی تھی۔“

”پھر وہی.... مس ڈھو۔ اے میں کہتا ہوں مجھے بھول جانے دو۔“

پھر مات آگے نہ بڑھ سکی۔ کیونکہ قاسم کی بیوی نے کافی تدارک رانے میں بڑی پھرتی دکھائی تھی۔

اس نے کافی میں شکر ملاتے ہوئے حمد سے کہا۔ ”مجھے تو اب خوف معلوم ہونے لگا ہے مس

”ڈھوئے۔“

”اللہ کرے وہ تمہیں کھاجائے.... کھاجائے۔“ قاسم حڑانے کے سے انداز میں ہوا۔

”مجھ سے ہر تکلیف امتناع کیا کرو۔“ یہی لائنوں پر بیٹھی چوٹی مرغی کی طرح بھول گئی۔

”یہ قسم ہے کہ میں نے یہ قسمیں کیں ہیں۔“

وہ کچھ بدلواں، قاسم جی کا رط ف، اے رط ج، مکھڑا گجسرا سے کافی کارحکال، لعت، مکھ

کر دیا، یہ دیکھ کر اس نے ہنسنا شروع کیا۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس کی بیوی نے حمید سے کہا۔ ”پتہ نہیں کر مل صاحب
اوپر کیا کر رہے ہیں۔ ابھی نیچے اترے تھے کسی کو فون کیا۔ شاید یہاں کچھ سامان منگوا رہے ہیں۔“
”سامان.....!“

”جی ہاں! میں نے پوری بات نہیں سنی تھی۔ بہر حال انہوں نے یہاں کچھ منگوا ضرور ہے۔“
”ہا..... ہا..... حمید بھائی۔“ دفعتاً قاسم اس طرح چکا جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔ ”ابے میں شاعری
کرنے لگا تھا۔ کتنا گج کا کہا ہے..... تم بھی دیکھو..... ٹھیک ہے یا نہیں۔“
وہ بھدی اور بے ہنگم آواز میں گانے لگا۔

ہو غمیں قلعے تے پار..... ہو ہو ہو

تم اس طرح قیوں مسکراتی ہو... بہار کی اماں جان

”بہار کی اماں جان۔“ حمید نے قہقہہ لگایا اور قاسم کی بیوی بھی بے تحاشہ ہنس پڑی۔

”قیوں.....!“ قاسم آنکھیں نکال کر بولا۔ ”کیا گلت ہے۔“

”شاید تمہارے ذہن میں ”جان بہار“ تھا کیوں؟“

”ٹھیکہ بہار تھا.....“ قاسم دانت پیس کر بولا۔ ”اے تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو۔“

”اے حمید بھائی۔“ قاسم کی بیوی بولی۔ ”میں نے بھی کچھ بلینک دورس میں کہا ہے۔“

”آہا..... آپ تو ضرور سنائیے۔“

نظم کا عنوان ہے ”توند“ قاسم کی بیوی نے کہا اور نظم شروع کر دی۔

توند کی ساخت کے اسرار بہت ہیں ہمد

طب بھی خاموش ہے اس عقدہ لائخل

خود بخود ہو نہیں سکتا شکم میں یہ تناؤ

پیٹ بے وجہ کبھی بن نہیں سکتا گتبد!

اک طرف دیکھ کھڑے ہیں وہ جناب ڈلپ

پینٹ کھسکا ہی چلا جاتا ہے گھٹنوں کی طرف

کوٹ کے کاج بھی منت کش بوتام نہیں

دوسری سمت ہے درزی سے کوئی تیز کلام!

شیروانی بھی تو کم بخت کبھی فٹ نہ ہوئی
بند لگتے ہی نہیں جھول ہیں دامن پہ پڑے
”اے..... بس کھاموش۔“ یک بیک قاسم دہاڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”قیوں.....؟“ اس کی بیوی نے اس کے انداز میں آنکھیں نکالیں۔

”تم میرا مزاج اڑا رہی ہو..... تمہاری ایسی کی تیشی۔“

”کیا کر لو گے..... میرا۔“ وہ بھی کھڑی ہو گئی۔ ”تم اپنے باپ کو گالیاں دیتے ہو۔ انہیں

کوستے ہو۔ شرم نہیں آتی۔ میرا مذاق اڑانا تاکراں گزرتا ہے۔“

قاسم کے غصے پر پھر برف پڑ گئی۔ وہ چند لمحے برا سامنہ بنائے کچھ سوچتا رہا پھر حمید کی طرف

ہاتھ ہلا کر بولا۔

”سالے تم جب بھی آتے ہو یہاں یہی سب قہقہے ہونے لگتا ہے۔“

”خیر آپا جان کی خاطر میں سالا ہی سہی۔ مگر میری وجہ سے کیا ہوتا ہے۔“

قاسم کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فریدی اور مس ڈھو پھر کمرے میں داخل ہوئے۔ مس ڈھو اب

پہلے سے بھی زیادہ متفکر نظر آرہی تھی۔ حمید یہ معلوم کرنے کے لئے بے چین تھا کہ دونوں کے

درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی۔ دفعتاً اسے اس آدمی کا بھی خیال آگیا جو آج کل مس ڈھو سے شادی

کرنے کا خواہاں تھا۔ کیا وہ آدمی اس کیس کے سلسلے میں کار آمد ثابت ہو سکتا ہے؟..... یہ بھی

ممکن تھا کہ وہ سرے ہی سے غیر متعلق ہوتا۔ مگر..... کیا فریدی نے اس کے امکانات پر غور نہ کیا

ہوگا؟ تو پھر اس نے اس سلسلے میں کیا کیا۔ حمید کو اس کا علم نہیں تھا۔

وہ دونوں کو گھورتا رہا لیکن وہ خاموش ہی رہے۔

”کیا اب آپ کھانا کھائیں گے۔“ قاسم کی بیوی نے پوچھا۔

”ضرور.....!“ فریدی مسکرایا اور قاسم کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا خیال.....!“

”جی ہاں..... جرور..... جرور..... بالکل جرور..... ہی ہی ہی۔“

لیکن ٹھیک اسی وقت انہوں نے شور سنا اور فریدی اٹھ کر دروازے کی طرف جھپٹا۔

پھر چنگھاڑتی ہوئی سی آواز آئی۔ ”مس ڈھو..... باہر آؤ۔“

فریدی اور حمید برآمدے میں پہنچ چکے تھے اور حمید نے دیکھا کہ کچھلی رات والا بھوت اس

وقت پھر کمپاؤنڈ میں موجود ہے۔ وہی صورت شکل۔ ویسا ہی لباس۔ ویسی ہی بڑے بالوں والی ٹوپی۔ قد بھی وہی تھا۔ جسامت بھی ہو بہو وہی تھی۔ وہ روشنی میں نہایا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ روشنی دوسرے لائٹس کی تھی، جو دو مختلف سمتوں سے اس پر پڑ رہی تھی۔ شاید سرچ لائٹ استعمال کرنے والے فریدی ہی کے آدمی تھے۔ پھر حمید نے دیکھا کہ ہندی کی بازہ کی اوٹ سے تین چار آدمی نکلے جن کے ہاتھوں میں رسیوں کے لچھے تھے۔ دراز قد بھوت کو چاروں طرف سے گھیر کر اس پر پھندوں والی رسیاں پھینکی جانے لگیں۔

دفعۃً حمید نے پشت پر مس ڈھو کی چیخ سی۔ ”وہی ہے.... وہی ہے.... وہی۔“

وہ تیزی سے مڑا اور پھر اگر جھپٹ کر اسے ہاتھوں پر نہ سنبھالا ہوتا تو وہ پچھلی دیوار سے ٹکرا کر فرش پر ڈھیر ہو گئی ہوتی۔

وہ بیہوش ہو گئی تھی۔ حمید نے بہ آہستگی اسے فرش پر ڈال دیا اور پھر فریدی کے قریب آکھڑا ہوا۔ فریدی کی نظریں اسی ”بھوت“ پر جمی ہوئی تھیں اس نے ایک بار بھی مڑ کر ڈھو کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

”مجھے جانے دیجئے۔“ قاسم بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں دیکھوں گا سالے تو۔“

”ٹھہرو.... تم برآمدے سے نیچے قدم نہیں اتارو گے۔“ فریدی نے اسے ڈانٹا اور قاسم کچھ بددرا کر رہ گیا۔

دوسری طرف وہ دیو پیکر بھوت رسیوں کے الجھیڑوں سے خود کو بچانے کے لئے اچھل کود رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ رسی پھینکنے والوں پر بھی چڑھ دوڑتا۔ لیکن وہ لوگ بھی بلا کے پھر تیلے تھے۔ حمید ان میں سے کسی کو بھی نہ پہچان سکا۔ ممکن ہے کہ وہ فریدی کی پراسرار بلیک فورس کے آدمی رہے ہوں۔

ایک بیک وہ دیو پیکر بھوت گھنٹوں کے بل بیٹھ گیا کیونکہ وہ بیک وقت دو رسیوں کے پھندوں سے جکڑ گیا تھا اور رسیاں دو مخالف سمتوں سے کھینچی جا رہی تھیں۔ اب وہ کسی جال میں پھنسے ہوئے وحشی درندے کی طرح شور مچا رہا تھا۔ حلق سے طرح طرح کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

دیکھتے دیکھتے اس نے اپنا سر زمین پر دے مارا.... اور پھر ایسا زور دار دھماکہ ہوا کہ پوری عمارت جھنجھٹا اٹھی.... دھماکے کے ساتھ ہی روشنی کا تیز جھماکا ہوا اور اب گہرا دھواں اس لمبی

بڑگی لاش پر ہلکورے لے رہا تھا۔ لاش.... جس کا سر غائب تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سب لاش کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ فریدی اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے جیب سے محدب شیشہ نکالا اور شانوں کے درمیان سرخ رنگ کے اس غار کو دیکھنے لگا جہاں تھوڑی دیر قبل ایک بھیانک چہرہ گردن سمیت موجود تھا۔

میں منٹ کے اندر ہی اندر کمپاؤنڈ میں لا تعداد سرخ ٹوپیاں نظر آنے لگیں۔ کانشیلوں سے بھری ہوئی کئی گاڑیاں پہنچ گئی تھیں۔ کچھ بڑے آفیسر بھی آئے تھے۔

دوسری طرف مس ڈھو کو ہوش آچکا تھا مگر اس کی حالت سے ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ رہ سکے گی۔

”آہ.... کر ٹل.... وہ بلاشبہ ڈاکٹر دو بے تھا۔ میرے خدا۔“ وہ نحیف آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”مگر وہ اتنا مجیم شیم کب تھا۔ وہ متوسط قد رکھتا تھا۔ پانچ فٹ کچھ اونچ کا! میں پاگل ہو جاؤں گی.... کر ٹل.... خدا کے لئے مجھے بچائیے۔“

”تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔ ”اس فکر میں نہ پڑو۔“

چوہایا کتا

وہ ساری رات حمید نے الجھنوں میں گزار دی۔ اسے قاسم کی کوششی ہی میں ٹھہرنا پڑا تھا اور فریدی تو لاش کے ساتھ ہی وہاں سے چلا گیا تھا۔ بہر حال یہ اسی کی ہدایت تھی کہ حمید رات وہیں گزارے۔ مس ڈھو کی حالت ابتر تھی۔ ساری رات دو ڈاکٹر اس کے قریب موجود رہے تھے۔ قاسم شدت سے بور ہوتا رہا تھا۔ لیکن اس نے بیوی کی یہ بات نہیں مانی تھی کہ ایسے میں کھانے کا ہوش کسے ہو سکتا ہے۔

وہ چھاتی ٹھونک کر بیوی سے بولا تھا۔ ”ارے مرغی ہو گی تمہاری بھوک! میری تو زندہ ہے.... خانالگو! میز پر درنہ میں تمہاری بوٹیاں تل کر کھاؤں گا! میرے ٹھیکے پر لاش واش.... کیا میں اس سالے کو بلانے گیا تھا۔ کل بھی آکر مر گیا.... آج بھی آکر مر گیا.... واہ.... ایسی کی تھیں.... کوئی کب تک بھوکا ہے۔“

حمید کو رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ قاسم کی بیوی بھی نہیں سوئی تھی۔ لیکن قاسم کے

”ٹھیک ہے! دھماکوں کا مقصد یہی ہے کہ سر اڑ جائے۔ یعنی یہ نہ معلوم ہو سکے کہ ڈاکٹر دو بے کے اتنے ہم شکل کیسے پیدا ہو گئے۔ اس کے لئے ہر پہلو پر غور کیا گیا ہو گا۔ اس کا ثبوت اسی سے ملتا ہے کہ گولی خواہ جسم کے کسی حصے پر پڑے سر ضرور اڑ جاتا ہے۔ اگر اسے زندہ پکڑنے کی کوشش کی جائے تو وہ خود ہی اپنا خاتمہ کر لے گا۔ زمین پر سر دے مارنا اسی پر دلالت کرتا ہے۔ آؤ میں تمہیں وہ لباس دکھاؤں جو ایک لاش سے الگ کیا گیا ہے۔۔۔۔۔ شاید تم کسی حد تک سمجھ سکو۔“

وہ دونوں تجربہ گاہ میں آئے۔ یہاں ایک میز پر حمید کو اسی قسم کے جیکٹ اور چست پاجامے نظر آئے جیسے اس نے دونوں پر اسرار عرفیتوں کے جسموں پر دیکھے تھے۔

حمید نے انہیں اٹھا کر دیکھا اور وہ اسے اندازے سے کہیں زیادہ وزنی معلوم ہوئے۔ یہ کیڑا سے بنائے گئے تھے اور ان کا استر پتلے ربر کا تھا اندرونی سطح اس استر سے پوری طرح ڈھکی ہوئی تھی۔

”بہت وزنی ہیں۔۔۔۔۔!“ حمید نے فریدی کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”وجہ ہے۔۔۔۔۔!“ فریدی مسکرایا۔ ”ادھر دیکھو۔“

اس نے ایک گوشے سے ربر کا استر ہٹایا جو شاید پہلے ہی اڑھڑا گیا تھا۔

حمید نے استر اور کیڑا کے درمیان باریک تاروں کا ایک جال سا دیکھا اور پھر فریدی کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔ فریدی کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے جواب کی توقع حمید ہی سے رکھتا ہو۔

”ہوں۔۔۔۔۔ کیا خیال ہے۔“ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تاروں کا جال۔“

”اسی سے اندازہ کرو۔“

”ہو سکتا ہے کہ کوئی برقی نظام۔۔۔۔۔ مگر ٹھہریے۔۔۔۔۔ وہ تو گوشت و پوست کے آدمی تھے۔“

”میں کب کہتا ہوں کہ وہ کسی برقی نظام کے تحت متحرک تھے۔“ فریدی نے کہا۔

”پھر۔۔۔۔۔!“

”میارا پوئلور کی گولی اس کیڑا کے جال اور ربر کے استر سے گذر کر جسم میں نہیں داخل ہو سکتی۔“ فریدی نے سوال کیا۔

خراٹے اس کی خواب گاہ کے پاس تھے۔

حمید ڈاکٹر دو بے کے متعلق۔۔۔۔۔ تک دو ہم شکل خود اس کی نظروں سے گذرے تھے۔ تیسرے کو سر جوزف نے۔۔۔۔۔ س ڈھوا اور سر جوزف کے بیان کے مطابق وہ تینوں ہی ڈاکٹر دو بے کی سی شکل رکھتے۔

دوسری صبح اس نے فریدی کی کال ریسپور کی۔ وہ گھر ہی سے بول رہا تھا اور حمید کو فوراً طلب کیا تھا۔

حمید نے قاسم کی گاڑی سنبھالی اور گھر پہنچ گیا۔ نیند سے بد حال ہو رہا تھا۔ ہوا کی سرسراہٹ بھی گراں گذر رہی تھی۔ مزاج میں چرچا ہٹ پیدا ہو گئی تھی مگر وہ ڈاکٹر دو بے کے متعلق اپنی الجھن ہر حال میں رفع کرنا چاہتا تھا۔

”کیا تم سوئے نہیں۔“ فریدی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ مجھے سونے کے لئے وہاں چھوڑ آئے تھے۔“

”واہ۔۔۔۔۔ واقعی۔۔۔۔۔ تم بہت گریٹ ہو۔“ فریدی مسکرایا۔ ”مجھے احساس ہے کہ بعض اوقات

میں تم پر زیادتیاں بھی کر جاتا ہوں۔ مجھے تم سے کہہ دینا چاہئے تھا کہ تم سو سکتے ہو۔ محض احتیاطاً تمہیں وہاں چھوڑا گیا تھا۔ باہر کافی انتظام کر دیا تھا میں نے۔ تم دیکھ ہی چکے ہو۔“

حمید چونکہ جلد از جلد ڈاکٹر دو بے کے متعلق گفتگو شروع کر دینا چاہتا تھا لہذا اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔

”کیا آپ کو علم تھا کہ کوئی دوسری بار بھی مس ڈھوکے لئے وہاں آئے گا۔“ اس نے پوچھا۔

”علم نہیں بلکہ خدشہ تھا۔ سر جوزف کی ادھوری کہانی ہی نے یہ خدشہ پیدا کیا تھا۔ میری

دانت میں کوئی ڈاکٹر دو بے کے نام پر ہراس پھیلانے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کے لئے اس

نے ان لوگوں کو منتخب کیا ہے جو ماضی میں کسی نہ کسی طرح ڈاکٹر دو بے سے متعلق رہ چکے ہیں۔ ایسا

سمجھنے کی وجہ وہ دھماکے ہیں جو ان پر اسرار عرفیتوں کی کھوپڑیاں غائب کر دیتے ہیں۔“

”چلے میں اسے تسلیم کئے لیتا ہوں۔۔۔۔۔ مگر دھماکے۔۔۔۔۔ میں نے اس کی ران پر گولی ماری

تھی لیکن سر اڑ گیا۔ سر جوزف نے سینے پر فائر کیا لیکن سر ہی پر آفت آئی اور پھر پچھلی رات اس

وقت دھماکہ ہوا تھا جب اس نے اپنا سر زمین پر دے مارا تھا۔“

”یقیناً ہو سکتی ہے۔“

”لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا۔“

”کیوں نہیں ہو سکا تھا۔“

”معلوم کرنے کی کوشش کرو....!“ فریدی مسکرایا۔

”بھئی میں ابھی قلندری کی ان منزلوں پر نہیں پہنچا۔“ حمید جھنجھلا گیا۔

”آنکھیں کھلی نہیں رکھتے۔“

”خیر وہ کچھ سہی! فی الحال میں سننا چاہتا ہوں۔ شب بیداری کی وجہ سے ذہن معطل سا ہو رہا ہے۔“

”قاسم کے اس کبرے ہی میں تمہیں بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا جہاں تم نے اس پر فائر کیا تھا۔“

”مجھے اس کی مہلت ہی کہاں ملی تھی۔ اس وقت تو پچانی لگا دی تھی آپ نے۔“

”خیر.... میں نے بھی اس چیز کا اندازہ کل ہی لگایا تھا۔ گولی اس کے جسم سے ٹکرا کر سامنے

والی دیوار سے جا ٹکرائی تھی اور اس نے نہ صرف پلاسٹر اوہیز اٹھا بلکہ اینٹوں پر بھی اثر انداز ہوئی

تھی۔ اب تم خود ہی غور کرو کہ یہ کتنی حیرت انگیز چیز تھی۔ مجھے دیوار کا سورج کچھ عجیب سا لگا اور

میں نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد اسی جگہ کھڑے ہو کر جہاں تمہارے بیان کے مطابق وہ کھڑا تھا

سامنے والی دیوار پر فائر کیا اور پھر ساری حقیقت واضح ہو گئی۔ براہ راست فائر کرنے سے بھی دیوار

میں اتنا ہی گہرا سورج ہوا تھا جتنا اس گولی سے ہوا تھا جو اس کے جسم سے ٹکرا کر دیوار پر لگی تھی۔“

فریدی خاموش ہو کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”کیا کہا آپ نے اتنا ہی گہرا سورج ہوا تھا۔“ حمید نے تحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکائیں۔

”ہاں اتنا ہی گہرا۔“

”اوہ.... تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ اس کے جسم سے ٹکرا کر بھی گولی اتنی ہی فورس سے

اچٹی تھی جتنی فورس سے ریو اور سے نکلتی ہے.... مگر یہ ناممکن ہے۔“

”گڈ....!“ فریدی مسکرایا۔ ”اسی خیال نے مجھے تاروں کے اس جال کے متعلق سوچنے پر

مجبور کیا تھا۔ اب دیکھو.... جس چیز میں گولی کو واپس کرنے کی اتنی قوت موجود ہو وہ اسے جسم میں

کیسے پیوست ہونے دے گی۔“

”اوہ.... تو یہ تار کیسے ہیں۔“

”تار تو بالکل معمولی ہیں.... یہ دیکھو۔“ فریدی نے جیکٹ کا ایک حصہ اسے دکھایا جس میں

بڑا سا سورج تھا اور پھر بولا۔ ”میں نے اس پر فائر کیا تھا لیکن گولی اس سے گذر گئی۔“

”پھر آپ کس نتیجے پر پہنچے ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ ان کی ٹوپوں ہی میں سب کچھ تھا۔ ایک ایسی بیٹری جس سے ان تاروں

میں مخصوص قسم کے برقی رو دوڑتی رہتی ہوگی اور بیٹری ہی کے کسی حصے میں یا اس سے الگ کوئی

پھٹ جانے والا مادہ بھی ہوگا۔“

”اس کے علاوہ اور کچھ سوچا بھی نہیں جاسکتا۔“ حمید نے کہا اور پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔

فریدی کچھ سوچ رہا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”سر جوزف کا ایک خط آیا ہے اس کی

حالت بگڑتی ہی جا رہی ہے۔ وہ مجھے اپنی کہانی سنانے پر مصر ہے اس سے پہلے نہیں مرنا چاہتا.... یہ

خط دیکھو۔“

اس نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر حمید کی طرف بڑھا دیا۔ خط کا مضمون تھا۔

”مائی ڈیز کرمل فریدی!“

میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری تکلیف پر نظر رکھی تھی مگر میں آپ کو

بتانا ہی چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں اب زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکوں گا۔ ہو سکتا ہے

ہسپتال سے گھر جانے کی نوبت ہی نہ آئے لہذا آپ مجھ سے مل لیجئے۔ مجھے کبھی یقین نہیں آیا تھا

کہ ڈاکٹر جل مرا ہوگا۔ وہ اب مرا ہے۔ میرے ہاتھوں۔ وہ دیو پیکر آدمی ڈاکٹر دو بے ہی تھا۔ مجھے

یقین ہے۔ آپ آئیے! میں آپ کو اپنے اس یقین کی وجہ بھی بتانا چاہتا ہوں۔ مجھے اس سے ہمیشہ

ہمدردی رہی ہے کرمل۔ مگر میں اس سے متنفر تھا۔ میں آپ کا منتظر ہوں۔ جتنی جلدی ممکن ہو مل لیجئے۔“

حمید نے خط کو تہہ کر کے ایک طرف میز پر رکھ دیا اور پائپ سلا کر دو تین کش لئے پھر

بڑبڑایا۔ ”اس بیچارے کو کیا پتہ کہ اب تک تین ڈاکٹر دو بے ختم ہو چکے ہیں۔“

”ہوں....!“ فریدی نے متشکرانہ انداز میں کہا۔ ”میں کچھ اور بھی سوچ رہا ہوں۔ مگر ٹھہرو

کیا تم میرے ساتھ چلو گے۔ لیکن یہ ضروری بھی نہیں ہے۔ تم رات بھر جاگے ہو۔“

”میں سر جوزف کی کہانی سننا چاہتا ہوں۔“

”اچھا تو چلو.... تیاری کے لئے صرف بیس منٹ دے سکتا ہوں۔“ فریدی نے کھائی کی

گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

پینتالیس منٹ بعد وہ سول ہسپتال میں نظر آئے۔ سر جوزف کے کمرے میں دو زسیر موجود تھیں۔ جوزف نے ہاتھ ہلا کر انہیں باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ نظر آرہی تھی۔ چہرہ حیرت انگیز طور پر دبلا ہو گیا تھا۔ حمید نے صرف دو دن پہلے اسے دیکھا تھا اور اب ان دونوں میں اس کے ڈھانچے میں جو تبدیلیاں ہوئی تھیں ان کے متعلق مشکل ہی سے یقین کیا جاسکتا تھا کہ اس بد حالی میں دو دن سے زیادہ نہیں لگے۔

”بہت اچھا ہوا کرل آپ آگئے۔“ اس نے مضحک سی آواز میں کہا۔ ”مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ مصروف نہ ہوں۔“

وہ دونوں بیٹھ گئے۔ فریدی نے اس کی خیریت دریافت کی۔

”میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ دل کی دھڑکنیں کتنی دیر بعد بند ہو جائیں گی لیکن انہیں بند ہی ہونا ہے کرل۔ میں بہت تھک گیا ہوں اب سونا چاہتا ہوں۔ مگر خدا کی قسم! میرا ضمیر مجھے ملامت نہیں کر رہا۔ میرے دل پر کسی قسم کا بار نہیں ہے۔ ابھی آپ خود ہی اندازہ کر سکیں گے کہ میں کتنا بے بس تھا۔ ڈاکٹر دو بے بد قسمت تھا۔ قدرت ہم دونوں کو.... میرے خدا.... مجھے اظہار خیال کیلئے الفاظ نہیں ملتے۔“ اس نے خاموش ہو کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا۔ حمید نے فریدی کی طرف دیکھا جو بڑی توجہ اور دلچسپی سے سر جوزف کو دیکھ رہا تھا۔

سر جوزف تھوڑی دیر تک گہری گہری سانسیں لیتا رہا پھر منہ پر سے ہاتھ ہٹائے بغیر بولا۔

”یہ میری زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے کرل۔“

”سر جوزف! میں پھر کہہ رہا ہوں کہ اگر آپ ٹکان محسوس کرتے ہیں تو کوئی غمناک واقعہ نہ دہرائیے۔ ہو سکتا ہے مجھے اس ٹریجڈی کا علم ہو چکا ہو۔“

”آپ جانتے ہیں۔“ سر جوزف نے یکتخت اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔

”ظاہر ہے کہ آپ سے ڈاکٹر دو بے کا تعلق معلوم ہو جانے کے بعد میں نے اس سلسلے میں چھان بین ضرور کی ہوگی۔“

”اوہ.... تو پھر آپ ہی انصاف کیجئے۔ کیا میں غلطی پر تھا۔ مجھے میرا قصور بتا دیجئے۔“

”کچھ نہیں! سر جوزف۔ صرف مقدمات! ڈاکٹر دو بے ایک بد نصیب آدمی تھا۔ ویسے میں

نے سنا ہے کہ عام حالات میں وہ خدا ترس بھی تھا۔“

”یہی تھا کرل.... لیکن مزاج میں جھلاہٹ بہت زیادہ تھی۔“

”خیر.... میں دراصل اس وقت اس لئے آیا تھا کہ آپ سے اس دیو پیکر لاش کے متعلق گفتگو کروں۔ آخر آپ کس بناء پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ ڈاکٹر دو بے ہی تھا۔“

”اوہ.... کرل.... یہ بات بتانے کے لئے بھی مجھے ماضی ہی میں جھانکنا پڑے گا۔ سلی نے مجھے وہ بات بتائی تھی لیکن میں نے اس وقت اسے ہنسی میں اڑا دیا تھا۔ کہا تھا کہ وہ خواہ مخواہ ڈاکٹر کو بڑھا رہی ہے۔ ڈاکٹر دو بے اتنا حیرت انگیز آدمی نہیں ہو سکتا۔ لیکن آج میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔“

”محترمہ سلی نے آپ کو کیا بتایا تھا۔“

”ڈاکٹر دو بے کی ایک تجربہ گاہ تھی، جہاں کوئی بھی نہیں جانے پاتا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ڈاکٹر راتوں کو جاگ کر وہاں کیا کیا کرتا ہے۔ لیکن ایک دن اتفاق سے شاید وہ تجربہ گاہ کا صدر دروازہ مقفل کرنا بھول گیا تھا۔ سلی گھر میں تھی اور ڈاکٹر ہسپتال چلا گیا تھا۔ سلی اس کی تجربہ گاہ میں داخل ہونے کے لئے بچپن رہا کرتی تھی۔ دروازہ کھلا دیکھ کر وہ بے تحاشہ اندر گھس گئی۔ اس کا بیان ہے کہ اس نے ایک میز پر ایک مردہ چوہا دیکھا تھا جو جسامت کے اعتبار سے کسی معمولی کتے کے برابر تھا۔ خوف سے اس کی نرئی حالت ہوئی تھی اور گہرا تجربہ گاہ سے نکل آئی تھی۔ شاید وہ ایسی پر ڈاکٹر دو بے کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا کیونکہ اس نے کچھ اس قسم کی باتیں شروع کر دی تھیں جن کے جواب میں سلی تجربہ گاہ میں اپنے داخلے کا اعتراف کر لیتی۔ لیکن سلی نے محتاط ہو کر جوابات دیئے تھے اس لئے ڈاکٹر مطمئن ہو گیا تھا کہ سلی تجربہ گاہ سے دور رہی ہے۔“

سر جوزف خاموش ہو گیا.... فریدی نے مضطربانہ انداز میں پہلو بدلا تھا۔ جب سر جوزف کا سکوت کسی طرح نہ ٹوٹا تو فریدی نے کہا۔ ”میں اس کے آگے بھی سننا چاہتا ہوں سر جوزف۔“

”اوہ.... اب آپ خود ہی اندازہ کیجئے جس شخص کی میز پر کتے کے برابر چوہا پایا جاسکتا ہے کیا وہ اپنی جسامت نہیں بڑھا سکتا۔“

”ہاں.... آں.... لیکن ہو سکتا ہے محترمہ سلی کو دھوکا ہوا ہو۔ وہ کسی دوسرے جانور کو اتنا بڑا چوہا سمجھ بیٹھی ہوں۔“

”خدا جانے! اس کے بعد مجھے اور کچھ نہیں معلوم ہوا تھا۔ میں نے اس وقت اس کے بیان کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ یہی سمجھا تھا کہ اسے کسی دوسرے جانور پر چوہے کا دھوکا ہوا ہوگا۔ لیکن کیا یہ فطری بات نہیں ہے کہ ڈاکٹر دو بے کو اس حیرت انگیز جسامت میں دیکھ کر مجھے سیلی کا واقعہ یاد آجائے۔“

”قطعی..... قطعی فطری بات ہے سر جوزف.....!“

”خاک ڈالنے..... وہ تو اب ختم ہی ہو گیا۔ وہ مگر دیکھنے میں کب تک اس آگ میں جھلکا رہتا۔ میرا زخم مندمل ہو چکا تھا کرل۔ لیکن اس نے یک بیک سامنے آکر ایک بار پھر مجھے زندگی سے بیزار ہو جانے پر مجبور کر دیا۔“

فریدی تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر پوچھا۔ ”کیا آپ کسی مس ڈھوکو بھی جانتے ہیں؟ کبھی ڈاکٹر دو بے کے ساتھ رہی ہو۔“

”یقیناً..... کیوں نہیں۔ سیلی والے واقعہ کے بعد ہی وہ ایک بد شکل نرس کو گھر لے گیا تھا اور وہ اس کے ساتھ ہی رہنے لگی تھی۔ وہ بیچاری اس رات بھی عمارت ہی میں تھی۔ جب آتشزدگی کا حادثہ ہوا تھا۔ لیکن وہ کسی طرح بچ نکلی تھی اور اب کہنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر دو بے بھی بچ گیا تھا۔ اتنے دنوں تک کہیں چھپا رہا۔ میرے خلاف اپنے غصے کی آگ دبائے رہا..... لیکن پر..... برداشت نہ کر سکا..... اودہ..... اودہ.....!“

”کیا یہاں اس شہر میں..... یا دنیا کے کسی گوشے میں کوئی اور آدمی بھی ایسا مل سکتا ہے جو ڈاکٹر دو بے کے حالات پر روشنی ڈال سکے۔“ فریدی نے پوچھا۔

سر جوزف کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ ”مس ڈھوکو تلاش کیجئے اگر وہ زندہ ہو شاید وہی آپ کو کچھ ایسی باتیں بتا سکے جو میرے علم میں بھی نہ ہوں۔“

”شکریہ سر جوزف۔“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔ ”آپ پریشان نہ ہوں۔ ڈاکٹروں نے آپ کی صحت کے بارے میں تشویش نہیں ظاہر کی۔“

”میں پریشان نہیں ہوں کرل۔“ سر جوزف غالباً زبردستی مسکرایا۔ ”یہ حقیقت ہے کہ اب میں زندہ رہنے کی خواہش نہیں رکھتا۔“

سر جوزف کے کمرے سے باہر آتے ہی حمید نے کہا۔

”ہمیں اس ڈفرنے ہمارا وقت نہیں برباد کر لیا۔“

”اگر تم اس سوال کی موافقت میں کچھ سوچ رہے ہو تو مجھے کہنے دو کہ تم غلطی پر ہو۔“ فریدی اسٹیئرنگ سنبال کر مسکرایا تھا۔

”کیوں.....؟“

”ممکن ہے کہ سیلی سے اندازے کی غلطی نہ ہوئی ہو۔“ فریدی نے کہا اور پھر کسی سوچ میں گم ہو گیا۔

کہانی اور تصویر

اب وہ قاسم کی کوٹھی کی طرف جا رہے تھے اور حمید کی نیند غائب ہو چکی تھی گود بن مضحل تھا لیکن وہ کسی قسم کی جسمانی تھکاوٹ نہیں محسوس کر رہا تھا۔

”سر جوزف کی کہانی تو رہ ہی گئی۔“ اس نے کہا۔

”مجھے افسوس ہے۔“ فریدی مسکرایا۔ ”اس کی کہانی تو ان دونوں کے متعلق چھان بین کرنے کے دوران ہی میں مجھے معلوم ہو گئی تھی۔ اس لئے میں نے ضروری نہیں سمجھا تھا کہ اس کی زبان سے دوبارہ سنوں۔“

”یہ سیلی کون تھی۔“

”ڈاکٹر دو بے کی پروردہ ایک لڑکی۔ پروردہ نہ کہنا چاہئے کیونکہ وہ نوجوان ہی تھی، ڈاکٹر دو بے نے صرف اس کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔ وہ ایک نادار اور لاپائج بیوہ کی لڑکی تھی۔ ڈاکٹر دو بے اس کا علاج کر رہا تھا۔ لیکن اسے پہچانے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ مرتے وقت اس نے اپنی بیٹی کے مستقبل کے بارے میں بڑی پریشانی ظاہر کی تھی۔ ڈاکٹر دو بے نے اسے اطمینان دلایا کہ وہ بے فکر رہے کیونکہ وہ اسے اپنی سرپرستی لے رہا ہے۔ بڑھیا کی موت کے بعد ڈاکٹر دو بے سیلی کو اپنے گھر لے گیا تھا۔ اس نے اس کے ساتھ تین سال گزارے۔ ڈاکٹر اس پر بے حد مہربان تھا۔ دوسری طرف ڈاکٹر دو بے اور سر جوزف گہرے دوست تھے۔ گو سر جوزف اس سے متنفر تھا۔ لیکن چونکہ ایک بار ڈاکٹر دو بے نے اسے ایک مہلک مرض سے نجات دلائی تھی اس لئے وہ اس کا بے حد گردیدہ ہو گیا تھا۔ سر جوزف کو سیلی سے انس ہو گیا پھر یہ چیز بڑھتے بڑھتے اس جنون میں تبدیل ہو گئی جسے تم عشق کہتے ہو اور قاسم محبت کہتا ہے۔ سر جوزف نے اس سے شادی کی خواہش ظاہر

حمید کچھ نہ بولا۔ وہ ان کے متعلق سوچ بھی کیا سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ ان کی نشوونما فطری طور پر نہیں ہوئی تھی۔

”میں ان کے متعلق کیا کہوں۔“ اس نے کہا۔ ”اگر یہ کہا جائے کہ ان کی نشوونما فطرت سے زیادہ کسی سائنسی عمل کی رہن منت ہے تو پھر شکل کا سوال پیدا ہو جائے گا۔ تینوں ہم شکل تھے۔“

”میک اپ۔“

”مگر کیا وہ آپ کو میک اپ معلوم ہوا تھا۔“ حمید نے سوال کیا۔ ”میری دانست میں تو وہ میک اپ نہیں تھا۔“

”میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔“ فریدی بولا۔ ”کیونکہ مجھے اسے قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔“

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد حمید نے کہا۔ ”ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ دونوں قاسم کی کوٹھی تک کیسے آئے ہوں گے۔ جہاں سے بھی آئے ہوں انہیں چلتی ہوئی شاہراہوں سے ضرور گزرنا پڑا ہو گا۔“

”قاسم کی کوٹھی کا محل وقوع تو ایسا ہی ہے لیکن وہاں تک انہیں چھپا کر بھی لایا جاسکتا ہے کسی بند گاڑی میں۔ پھر یائیں باغ میں ان کا داخلہ مشکل تو نہیں ہو سکتا۔“

”اچھا کیا آپ کو یقین ہے کہ ڈاکٹر دو بے مرعی گیا ہو گا۔“

”شائد میں نے یقین کے ساتھ کبھی نہ کہا ہو کہ وہ بھی وہیں جل مرا تھا۔ آخر مس ڈھو کیسے بچ نکلی تھی۔“

”میں بھی یہی سوچتا رہا ہوں؟“ حمید نے پاپ میں تمباکو بھرتے ہوئے کہا۔ ”اگر وہ حقیقتاً اسے جلا کر ہی مارنا چاہتا تھا اور خود بھی فنا ہو جانے کا ارادہ رکھتا تھا تو اس نے بچ نکلنے کے امکانات کا بھی جائزہ پہلے ہی لیا ہو گا۔ اس قسم کی اسکیمیں بڑے غور و خوض کے بعد مرتب کی جاتی ہیں، خواہ اس کا تعلق خود کشی ہی سے کیوں نہ ہو۔“

”گڈ.... اب تم راہ پر آرہے ہو۔“

”تو پھر میں یہ سمجھ لوں کہ ڈاکٹر دو بے زندہ ہے۔“

”فی الحال میں نے یہی فرض کر لیا ہے۔“

کی۔ اس لئے ڈاکٹر دو بے اس سے جھگڑا کر بیٹھا۔ دھکے مار کر گھر سے نکال دیا سر جوزف کو بڑبڑا کر۔ بقول کے دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی یعنی سیلی میں بھی اس جنون کے جراثیم پیدا ہو گئے تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر دو بے نے اپنی ڈھکی چھپی خواہش ظاہر کی۔ وہ بھی اس کے لئے اس جنون میں مبتلا تھا۔ سیلی کو جب یہ معلوم ہوا تو اس کی حالت غیر ہو گئی کیونکہ وہ تو اسے اس وقت تک اپنا مربی اور سرپرست سمجھتی رہی تھی۔ ایک طرف وہ اس کے احسانات کے بارے میں دلی ہوئی تھی اور دوسری طرف اسے سر جوزف کا خیال تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی صحت گرنے لگی۔ دوسری طرف سر جوزف بُری طرح بے تاب تھا۔ وہ چھپ چھپ کر اس سے ملتا رہتا اور اسے ترغیب دیتا کہ وہ اس کے ساتھ نکل چلے۔ سیلی پہلے تو انکار کرتی رہی پھر رضامند ہو گئی۔ مگر وہ شہر سے باہر نہیں گئے۔ گو سر جوزف اس وقت خطاب یافتہ نہیں تھا۔ لیکن شہر کے ذی عزت لوگوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ دولت مند بھی تھا۔ سیلی سن بلوغ کو پہنچ چکی تھی اس لئے کسی قانونی کارروائی کا ڈر بھی نہیں تھا۔ دونوں نے سول میرج کر لی پھر ڈاکٹر دو بے سر جوزف کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ ایک دن زبردستی اس کے گھر میں گھس کر اس پر فائر کیا لیکن وہاں کئی ملازم بھی موجود تھے۔ فائر خالی گیا تھا اور انہوں نے اسے بے بس کر کے ریو اور چھین لیا۔ ڈاکٹر دو بے کو ناکام واپس ہونا پڑا تھا۔ مگر سر جوزف نے اس کی اطلاع پولیس کو نہیں دی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہی احساس بنا تھا کہ سیلی پر اس کے احسانات ہیں۔ سیلی اس غم میں گھلتی گئی کہ وہ دو دوستوں کے درمیان نفاق کا بیج بن گئی ہے۔ بلا آخر وہ ٹی بی میں مبتلا ہوئی اور پانچ سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکی۔ پھر سر جوزف کے سینے میں بھی سر دو بے سے دشمنی کی آگ بھڑک اٹھی۔ لوگوں کا خیال ہے کہ سیلی کے غم میں پھر اس نے دوسری شادی نہیں کی۔ بہر حال وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔“

حمید نے ہونٹ سکڑے اور پھر آہستہ سے بولا۔ ”مگر یہ کہانی ہمارے لئے فضول ہے کسی طرف بھی رہنمائی نہیں کرتی۔“

”ہاں.... کہانی فضول ہی سہی مگر وہ مردہ چوہا۔“

”ارے چھوڑیئے۔“ حمید ہاتھ ہلا کر بولا۔

”فی الحال یہی سہی۔ لیکن یہ واقعہ ہمیں کسی نہ کسی سمت ضرور لے جائے گا۔ اچھا چلو تم ان

دیو پیکر ہم شکلوں کے متعلق کیا خیال رکھتے ہو۔“

”مگر یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی دوسرا ہی ڈاکٹر دو بے کے پردے میں شکار کھیل رہا ہو۔“ حمید بولا۔ ”چند آدمیوں کو صاف کرنے کے لئے ڈاکٹر دو بے کے بعض حریفوں دشمنوں یا محبوبوں سے بھی تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کر لی ہو۔ تاکہ پولیس غلط راستے پر پڑ جائے اور وہ اپنی مقصد براری کے بعد بھی قانون کی زد سے محفوظ رہ سکے۔“

”اوہ.... اسی لئے تو ابھی میرا پہلا نظریہ محض ایک مفروضہ ہے اور تم دوسرے خیال کو بھی یقین کے سانچے میں نہیں ڈھال سکے۔“

”ٹھیک ہے.... مگر اصل مجرم تک رسائی کیسے ہوگی۔ مجھے تو ابھی تک کوئی صورت نہیں نظر آتی۔“

”بس دیکھتے جاؤ.... فی الحال میں اس آدمی کے چکر میں ہوں جس نے ابھی حال ہی میں مس دھو سے شادی کی درخواست کی تھی۔“

”وہی آپ کو کہاں مل جائے گا۔“

”اس کے لئے میں کام کرتا رہا ہوں حمید صاحب۔ اگر آپ پر نیند نہ سوار رہی تو آپ بہت کچھ دیکھیں گے.... آپا میں غلط جا رہا ہوں۔ نہیں اب ہم قاسم کے گھر نہیں جائیں گے۔“

”پھر....!“

”بس دیکھتے جاؤ۔“ فریدی مسکرایا۔

تھوڑی دیر بعد حمید نے محسوس کیا کہ گاڑی بندرگاہ کے علاقے کی طرف جا رہی ہے۔

اور پھر وہ ایک ہوٹل کے سامنے رک گئی، جو غیر معروف اور متوسط درجہ کا تھا۔

حمید نے ادھر سے گزرتے وقت اسے بار بار دیکھا تھا لیکن کبھی اندر جانے کی خواہش نہیں ہوئی تھی۔

وہ دونوں کار سے اترے لیکن حمید نے اسے ٹوکا نہیں.... وہ ہوٹل میں داخل ہو کر کاؤنٹر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا بھاری بھر کم آدمی انہیں دور ہی سے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ قریب پہنچنے پر اس نے فریدی کو سلام کیا۔

”آپ بیٹھے۔“ فریدی نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ”میا منقار صاحب موجود ہیں۔“

”جی ہاں.... وہ اپنے کمرے ہی میں ہیں جناب.... کیا ملواؤں۔“

”نہیں.... نہیں.... میں خود ہی مل لوں گا۔“ فریدی زینوں کی طرف مڑ گیا۔

ہال ہی کے ایک گوشے سے کچھ زینے اوپری منزل تک لے جاتے تھے۔ حمید چپ چاپ زینے ملے کرتا رہا۔ منقار قسم کا نام آج تک اس کے سننے میں نہیں آیا تھا۔ یہ منقار صاحب کون بزرگوار ہوں گے۔ اگر کچھ منقار ہی ثابت ہوئے تو بہت گراں گذریں گے۔ حمید نے سوچا اور بور ہوتا رہا۔ اب پھر اس کا ذہن نیند سے بو جھل ہونے لگا تھا۔

فریدی نے اوپر پہنچ کر ایک دروازے پر دستک دی۔

”آجاؤ....!“ اندر سے بھرائی ہوئی سی آواز آئی اور فریدی نے پینڈل گھما کر دروازہ کھولا۔ سامنے ہی کھڑکی کے قریب ایک ادھیڑ عمر کا آدمی آرام کرسی پر نیم دراز تھا انہیں دیکھتے ہی بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

”اوہ.... آپ ہیں.... تشریف رکھئے جناب.... تشریف رکھئے۔“

کمرے میں ایک ہی آرام کرسی تھی۔ فریدی پلنگ ہی پر بیٹھ گیا۔

”ادھر تشریف لائیے.... یہاں کرسی پر جناب۔“

”نہیں میں ٹھیک ہوں....!“ فریدی مسکرایا۔ ”فکاروں کے یہاں تکلفات کو دخل نہ ہونا چاہئے۔“

حمید بوکھلا کر اس کو گھورنے لگا کہ یہ منقار سے یک بیک فکار کیسے ہو گیا۔

”حمید ان سے ملو۔ یہ ایک مایہ ناز کارٹونسٹ ہیں۔“ فریدی نے اس کا تعارف کرایا۔ ”انہیں

بہت مشہور ہونا چاہئے تھا لیکن جانبداریوں نے انہیں ابھرنے نہ دیا۔“

حمید نے طوعاً و کرہاً اس سے ہاتھ ملایا اور دل ہی دل میں جھلتا رہا کہ آخر اس سلسلے میں کوئی کارٹونسٹ کہاں سے آچکا۔

”میں نے آپ کا کام مکمل کر لیا ہے جناب۔“ اس نے کہا اور میز پر رکھا ہوا فائل اٹھنے لگا۔

پھر اس سے ایک دفقی کا ٹکڑا نکالا جس پر بنی ہوئی تصویر کی بجلی سی جھلک حمید نے بھی دیکھی تھی۔

لیکن جب وہ تصویر فریدی کے ہاتھوں میں آئی تو حمید کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

ان میں سے ایک تصویر تو سو فیصدی مس ڈھو کی تھی اور دوسری کسی مرد کی۔ دونوں قریب

قریب بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے ایک چھوٹی سی میز تھی۔

”کمال ہے۔“ فریدی کارٹونسٹ کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

”یہی کہ آپ کو کسی منقار کی تلاش تھی۔ مگر وہ فنکار نکلا۔“

فریدی ہنسنے لگا۔ مگر پھر وہ بولا۔ ”حمید صاحب وہ حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک ہے۔ بہر حال نہیں اس پر حیرت ہوگی کہ ایک بیک میں نے اسے کہاں سے کھود نکالا۔ میں دراصل ان جگہوں پر پوچھ گچھ کرتا رہا ہوں۔ جہاں مس ڈھونے اس نامعلوم آدمی کے ساتھ کبھی کبھی تھوڑا سا وقت بھی گزارا ہے۔ یہ ہوٹل تو ان کی نشست کے لئے مخصوص تھا۔ وہ دونوں اکثر یہیں رات کا کھانا کھاتے تھے۔ جوڑا چونکہ اپنی نوعیت کا ایک ہی تھا اس لئے جس نے ایک بار بھی انہیں ساتھ دیکھا پھر نہ بھلا سکا۔ یہاں کے مالک سے میں نے اس جوڑے کے متعلق پوچھا تھا اس نے اعتراف کیا کہ ایک ایسا مضحکہ خیز جوڑا وہاں اکثر آتا رہتا ہے اور پھر اس نے اپنے ایک کارٹونسٹ دوست کا تذکرہ کیا جو ہوٹل ہی میں رہتا تھا۔ اس نے کاؤنٹر پر بیٹھے بیٹھے اس مضحکہ خیز جوڑے کا کارٹون بنایا تھا۔ میں نے کارٹون دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ مجھے منقار کے پاس لے گیا۔ کارٹون دیکھا تو عورت کی تصویر میں مس ڈھو کی مضحکہ خیز جھلکیاں نظر آئیں۔ اس لئے میں نے سوچا کہ مرد کی تصویر بھی اصل سے کچھ نہ کچھ مطابقت ضرور رکھتی ہوگی۔ جب منقار کو یہ معلوم ہوا کہ میں ان دونوں کے خلاف کسی مقدمے کے سلسلے میں تفتیش کر رہا ہوں تو وہ ان کی سیدھی سادی تصاویر بنانے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ محض یادداشت کے سہارے قریب قریب ساری تفصیل واضح کر سکتا ہے اور میری دانست میں اس کا دعویٰ غلط بھی نہیں ہے۔ کیا مس ڈھو کے سلسلے میں کوئی تفصیل نظر انداز ہوئی ہے۔“

”میں خود بھی متحیر ہوں۔“ حمید نے کہا۔ ”محض یادداشت کے سہارے ایسی تصویر پینٹ کرنا یقیناً معجزہ کہلائے گا۔“

حمید نے ایک بار پھر تصویر پر نظر ڈالی۔ یہ سفیدہ اور سیاہی سے پینٹ کی گئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ دور سے دیکھے جانے پر یہ فوٹو گراف ہی معلوم ہوگی۔

قاسم کے گھر پہنچ کر فریدی نے مس ڈھو کے متعلق پوچھا۔ اس وقت قاسم اور اس کی بیوی موجود نہیں تھے۔ مس ڈھو اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی۔

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں اس کا انتظار کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد وہ دیوار کا سہارا لیتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ برسوں کی بیمار معلوم ہو رہی تھی۔

”ارے آپ تو ایک بلند پایہ مصور بھی ہیں۔ آپ کو کارٹونسٹ کون کہتا ہے۔“

”میں خود ہی کہتا ہوں جناب۔“ آرٹسٹ مسکرایا۔ ”لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے بگڑا شاعر مرثیہ کوئی اختیار کرتا ہے اسی طرح نااہل مصور کارٹونسٹ بن جاتے ہیں، حالانکہ یہ غلط ہے۔ اچھے کارٹونسٹ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کا مصور بھی ہو، ورنہ اچھا کارٹونسٹ ہو ہی نہیں سکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے گھٹیا قسم کے انشا پرداز مزاح نگار نہیں ہو سکتے۔“

”بات چنے کی ہے۔“ فریدی مسکرایا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس مرد کی تصویر بھی اصل کے مطابق ہی ہوگی۔“

”دونوں میں سر مو فرق نہیں ہو سکتا۔“ اس نے ایک دوسرا شیٹ فائل سے کھینچتے ہوئے کہا اور اسے بھی فریدی کی طرف بڑھادیا۔

یہ اسی تصویر کا کارٹون تھا جو حمید نے پہلے دیکھی تھی۔

فریدی نے جیب سے سوسو کے تین نوٹ نکالے اور اس آرٹسٹ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اسے قبول کیجئے۔“

”ارے نہیں جناب۔ ہرگز نہیں۔۔۔ پولیس کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔“

”یہ تصاویر میری ذاتی ملکیت ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک مقدمے میں ان سے مدد بھی مل جائے گی۔ کیا یہ آدمی پھر کبھی یہاں نظر آیا تھا۔“

”جی نہیں۔۔۔ میں نے تو نہیں دیکھا۔“

”اچھا شکریہ۔۔۔!“ فریدی اٹھ گیا۔

حمید کی نیند پھر غائب ہو گئی تھی۔ ڈائینگ ہال میں پہنچے ہی حمید تصاویر کے متعلق استفسار کر بیٹھا۔ ”ٹھہرو۔۔۔ ابھی بتاتا ہوں۔“ فریدی نے کہا اور ہال سے نکلتا چلا گیا۔

وہ پھر لنکن میں آئیٹھے اور فریدی نے مشین انساٹ کرتے ہوئے کہا ”عاباً تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ مس ڈھو کے ساتھ جو مرد ہے، وہی ہو سکتا ہے جس کی مجھے تلاش ہے۔“

”عاباً میں یہی سمجھتا ہوں۔“ حمید نے خشک لہجے میں کہا۔ ”لیکن یہ حیرت انگیز واقعہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آسکا۔“

”کون سا۔۔۔!“

”کیا دیکھا تھا۔“

”کتوں کے برابر چوہے.... ایک خرگوش جو معمولی قد کے بکرے کے برابر اونچا تھا۔ تین چار فٹ لمبے کچھوے جنہیں میں پہلے سانپ سمجھی تھی۔ لیکن ڈاکٹر نے مجھے تاکید کر دی تھی کہ میں کسی سے بھی ان کا تذکرہ نہ کروں۔“

”مگر مس ڈھو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ ہی کی طرح ڈاکٹر بھی بچ نکلا ہو۔“

”میں نے بھی اس پر غور کیا ہے مگر پھر وہ جلی ہوئی لاش کس کی تھی جو لمبے سے برآمد ہوئی تھی۔“

”ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ملازم کی لاش رہی ہو۔“

”نہیں جناب ہم دونوں کے علاوہ ایک تنفس بھی گھر میں موجود نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے کبھی کوئی گھریلو ملازم رکھا ہی نہیں۔ اپنے کام خود ہی کرتا تھا۔ مجھ سے پہلے ایک لڑکی سیلی وہاں رہتی تھی اس کے جانے کے تین سال بعد میں وہاں پہنچی تھی۔“

فریدی نے سیلی یا سر جوزف کے متعلق اس سے کسی قسم کے سوالات نہیں کئے۔ حالانکہ حیدر سر جوزف کے متعلق بھی پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔

اب فریدی نے منقار کی بنائی ہوئی تصویر نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔

”اوہ....!“ وہ یک بیک اچھل پڑی۔ ”یہ.... یہ کس نے بنائی ہے جناب.... مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میں نے کبھی کسی آرٹسٹ کو پوز دیا ہو۔ یا اس پر اسرار آدمی کے ساتھ کبھی کوئی تصویر کھینچوائی ہو۔“

”یہ وہی آدمی ہے نا۔“

”سو فیصدی وہی جناب۔ ذرہ برابر بھی فرق نہیں ہے۔“

”اچھا مس ڈھو۔ اب اجازت دیجئے۔“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔ ”کل آپ یہاں سے میرے گھر میں منتقل ہو رہی ہیں۔“

خوفزدہ اجنبی

اسی شام کو آفس میں فریدی کی میز پر منقار کی بنائی ہوئی تصویر کے لاتعداد فوٹو پر نشیں بکھرے ہوئے تھے۔ تصویر صرف اس پر اسرار آدمی کی تھی۔ مس ڈھو کی تصویر اس سے علیحدہ کر لی

”اوہ.... بیٹھے.... بیٹھے۔“ فریدی نے جلدی سے اٹھ کر اسے سہارا دیا اور ایک صوفہ میں بٹھاتا ہوا بولا۔ ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کی صحت اس قدر گر گئی ہے ورنہ میں آپ کے کمرے ہی میں پہنچنے کی کوشش کرتا۔“

”کوئی بات نہیں جناب۔“ وہ کمزور آواز میں بولی اور اس نے حسب عادت مسکرانے کی بھی کوشش کی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ ”کیا یہاں میرا ٹھہرنا ضروری ہے۔ دیکھئے اور کچھ نہ سمجھئے گا میں دراصل یہ نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے کسی کو تکلیف پہنچے.... صاحب اور بیگم دن رات لڑتے رہتے ہیں۔ بیگم صاحب کو مجھ سے ہمدردی ہے۔“

”میں آپ کو اپنے گھر لے چلوں گا۔ آپ فکر نہ کیجئے۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن اس وقت پھر آپ کو تکلیف ہی دینے آیا ہوں.... کیا آپ مجھے ڈاکٹر دو بے کی نجی مصروفیات کے متعلق بھی کچھ بتا سکیں گی۔“

”نجی مصروفیات....!“ وہ کسی سوچ میں پڑ گئی پھر یک بیک چونک کر متحیرانہ انداز میں بولی۔ ”یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔“

”اس لئے کہ اب تک تین ڈاکٹر دو بے مارے جا چکے ہیں۔“

”مم.... میں بھی سوچ میں تھی۔ نوکروں نے بتایا کہ جس پر کپتان صاحب نے فائر کیا تھا وہ بھی ویسا ہی تھا جیسا میری نظروں سے گذرا تھا۔ اوہ کر ٹل میں کیا بتاؤں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں بڑی الجھن میں ہوں.... اس کی جسامت.... میرے خدا.... مگر وہ اب اس دنیا میں کہاں ہے۔ شاید کوئی اور اسی کے نام پر اس کے تجربات سے غلط فائدہ اٹھا رہا ہے۔“

”تجربات.... کیا مطلب۔“

”اوہ.... وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ آج مجھ سے جو نفرت کرتے ہیں کل مجھ پر فخر کریں گے۔ دنیا کی حسین ترین لڑکیاں مجھ سے منسوب ہونے کے لئے زمین و آسمان ایک کر دیں گی۔ مغرب کے زیادہ تر بڑے آدمی بد صورت ہیں۔ لیکن ان کے پیچھے عورتوں کی فوج کی فوج نظر آتی ہے۔ ایک دن یہی حالت میری بھی ہوگی۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ آخر وہ کس بناء پر ایسا کہہ رہا ہے اس پر وہ مجھے پہلی بار اپنی تجربہ گاہ میں لے گیا اور میں نے وہاں ایسی چیزیں دیکھی تھیں کہ آج بھی یاد کر کے رو گئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔“

”سر جوزف.....!“

”اوہ.... تم نے ابھی تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔“

”وہ ڈاکٹر دو بے کا دوست تھا۔ ممکن ہے اسے ان تجربات کا علم رہا ہو۔ آج وہ ان سے کام لے رہا ہو۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ کوئی دوسرا آدمی ڈاکٹر دو بے کی آڑ لے کر اپنے دشمنوں کا صفایا اس طرح کر سکتا ہے کہ پہلے ڈاکٹر دو بے کے بعض شناساؤں سے چھیڑ چھاڑ کر بیٹھے پھر اپنے دشمنوں پر ہاتھ صف کرنا شروع کر دے اور پولیس چکر ہی کھاتی رہ جائے۔“

”تو صرف سر جوزف ہی کیوں حمید صاحب۔ یہی دلائل آپ مس ڈھو پر بھی لا دیتے ہیں۔“

”آہا تو میں اس کی طرف سے مطمئن کب ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ سب کچھ دونوں کی ملی بھگت سے ہو رہا ہو۔“

”اسی طرح کوئی تیسرا آدمی بھی ہو سکتا ہے جس کا علم ان دونوں کو بھی نہ ہو۔“ فریدی مسکرایا۔

”میں یہ دلائل اپنے پچھلے تجربات کی بناء پر پیش کر رہا ہوں۔ ہمیں بارہا ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے.... کئی کیس ہماری یادداشت میں ایسے محفوظ ہیں جن سے متعلق رکھنے والے انتہائی مظلوم آدمی ہی اصل مجرم ثابت ہوئے۔“

”اور حمید صاحب ایسے مظلوم آدمی بھی آپ کی یادداشت میں یقینی طور پر محفوظ ہوں گے جو آپ کے مظالم کے بھی شکار ہوئے تھے اور نتیجہ وہی ٹائیں ٹائیں فاش یعنی مجرم کوئی دوسرا ہی تھا۔ بعض اوقات تو ایسا ہی ہوا ہے کہ مجرم کوئی قطعی بے تعلق آدمی ثابت ہوا تھا جس پر پہلے ہماری نظر ہی نہیں پڑی تھی۔“

”اب تو قاسم ہی کے انداز میں کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ٹھیکے سے۔“ حمید جھلا گیا۔

”میں تو آج رات کو نیا گرا میں بیٹے دیکھوں گا۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ اس نے حمید کی منتخب کی ہوئی تصاویر سمیٹیں اور انہیں ایک چرمی تھیلے میں چند کاغذات، سمیت رکھ کر تھیلے کو سیل کرنے لگا۔

”یہ تصاویر بلیک فورس کے لئے ہیں.... یا جھکے کے آدمیوں کے لئے۔“ حمید نے پوچھا۔

”تم جانتے ہی ہو کہ ایسے غلط کے کام میری بلیک فورس ہی سرانجام دیتی ہے۔“

اس کے بعد پھر ان میں کسی قسم کی گفتگو نہیں ہوئی۔ آفس کا وقت دیر ہوئی ختم ہو چکا تھا اور

گئی تھی۔

حمید بہتر پرنٹ چھانٹ چھانٹ کر الگ کرنا جا رہا تھا اور فریدی کرسی کی پشت سے ٹکا ہوا سرگرم کے ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا۔

”تو آپ کا یہ نظریہ بھی ختم ہی ہو گیا کہ ڈاکٹر دو بے زندہ ہے۔“ نید نے سر اٹھائے بغیر کہہ

”اس کے متعلق میں اب بھی الجھن میں ہوں۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ ممکن ہے وہ جلی ہوئی لاش کسی ملازم کی رہی ہو لیکن مس ڈھو نے اس خیال کی سختی سے تردید کر دی۔“

”اور وہ نظریہ ختم ہو گیا۔“

”نن..... نہیں!.....“ فریدی نے متشکرانہ انداز میں سر کو جنبش دی۔ ”اس نظریہ کا ایک جواز اب بھی میرے پاس ہے۔ ہو سکتا ہے مس ڈھو کو وہاں اس آدمی کی موجودگی کا علم ہی نہ رہا ہو۔“

”یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ دن رات وہیں رہتی تھی۔“

”لیکن اس کے باوجود بھی اسے علم نہیں تھا کہ وہ کس قسم کی تجربہ گاہ ہے اور اس وقت تک علم نہیں ہو سکا جب تک ڈاکٹر دو بے نے خود نہیں چاہا۔“

”پھر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”بہی کہ جانوروں کے بعد آدمی ہی کی باری آتی ہے۔ اس قسم کے سارے تجربات مختلف قسم کے جانوروں سے گذر کر آدمی ہی تک پہنچتے ہیں کیا سمجھ۔“

”میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا۔“

”شائد تم پوری نیند نہیں لے سکے۔“ فریدی مسکرایا۔

”صرف تین گھنٹے سویا ہوں۔“

”خیر.... کیا یہ ممکن ہے کہ اس نے لا تعداد جانوروں کی طرح کوئی آدمی بھی پال رکھا ہو جس کا علم اس کے علاوہ اور کسی کو کبھی ہو ہی نہ سکا ہو۔ کیونکہ کسی آدمی پر اس قسم کے تجربات اسی وقت جائز ہیں جب قانون ان کی توثیق کر دے، ورنہ وہ جرائم ہی کے تحت آئیں گے۔ مجھے پچھلے پچاس سال کے ریکارڈ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی کو اس قسم کے تجربات کی اجازت دی گئی ہو۔“

”آپ دوسرے امکانات پر بھی کیوں غور کرتے۔“

”تم غور کر کے کسی نتیجے پر پہنچ چکے ہو تو مجھے بتاؤ۔“

آفسروں میں ان کے علاوہ صرف رات کی ڈیوٹی والے ہی اس عمارت میں نظر آرہے تھے۔

حمید کو تنہا گھر آنا پڑا کیونکہ فریدی اسے بتائے بغیر کہیں اور چلا گیا تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے کافی پی اور ایک صوفے میں ڈھیر ہو گیا۔ نیند پوری نہ ہونے کی بناء پر طبیعت کسلمند تھی۔ اس لئے اس نے کہیں باہر جانے کا ارادہ قطعی ترک کر دیا۔

آج سردی بھی گذشتہ دنوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی تھی۔ اس لئے تھکن کے عالم میں ”خاف“ سے زیادہ کسی دوسری عیاشی میں کوئی چارم نظر نہ آیا۔ مگر کھانے سے پہلے وہ اس عیاشی سے دور ہی رہنا چاہتا تھا۔ ورنہ شاید دوسرے ہی دن کھانا نصیب ہوتا، پتہ نہیں کیوں آج کل اس کی بھوک بھی قاسم ہی کی طرح کچھ ”غل“ سی گئی تھی۔

ساڑھے سات بجے اس نے رات کا کھانا تنہا کھایا۔ کیونکہ فریدی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ آٹھ بجے تک وہ کافی اور پائپ سے مشغول کرتا رہا اس کے بعد خواب گاہ کا رخ کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ یک بیک فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے جھلا کر ریسور اٹھالیا۔ فریدی کے علاوہ اور کون ہو گا۔ اس نے سوچا اور ابھی نادار شاہی حکم ملے گا کہ فلاں جگہ پہنچ جاؤ.... گاڑی ٹھیک نہ ہو تو دم ہی کے بل پھدکتے چلے آؤ۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن کال ریسور کرتے ہی جان میں جان آئی کیونکہ دوسری طرف سے قاسم کی آواز آئی تھی۔ ”اے.... بھاگو....!“ وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”جلدی آؤ.... ہجراؤں آگئے ہیں ہجراؤں ٹھائیں ٹھائیں دھائیں دھائیں ہو رہی.... اے جلدی.... سالے سور حمید بھائی اے تم لوگوں نے مجھے برباد کر دیا۔“ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔

”کیا ہے.... کون آگئے ہیں.... آہستہ بولو کیا بات ہے۔“

”اے وہی لمبے تڑنگے.... مس آلو کی پٹھی کے آشتیق.... جلدی آؤ سالے سور ورنہ میں اپنے گولی مار لوں گا.... پھر اس گلہری کی پٹی کو بھی مار ڈالوں گا جس کی وجہ سے یہ سالی مس ڈھو.... اس کی تو ایسی کی تیبی.... ارے باپ رے حمید بھائی کھدا کے لئے جلد آؤ.... ارے.... ہجراؤں ہیں۔“

”ویسے ہی جیسا آدمی پچھلی رات تمہاری کمپاؤنڈ میں مرا تھا۔“ حمید نے پوچھا۔

”اے ہاں ہاں.... بل قل وہی.... مس ڈھو قہتی ہے سالی کو سب ڈاکٹر دو بے ہیں۔ میں کہتا ہوں ڈاکٹر ٹھیکے ہیں.... ایسی کمینی اور جھوٹی عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی.... سب سالے ڈاکٹر دو بے قیسے ہو سکتے ہیں۔“

”اچھا.... اچھا میں فوراً آرہا ہوں.... کیا کمپاؤنڈ میں روشنی ہے۔“

”ہے.... بہت تیز روشنی....!“

حمید سمجھ گیا کہ فریدی کے آدمی اب بھی کوٹھی کی گمرانی کرتے رہے ہیں۔ اس وقت بھی انہوں نے سرچ لائٹس استعمال کی ہوں گی اور ان پر فائر بھی کر رہے ہوں گے کیونکہ قاسم کی ٹھائیں ٹھوئیں اور دھائیں دھوئیں کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ان پر فائر بھی ہو رہے ہیں اور دھا کے ان کی کھوپڑیاں بھی اڑا رہے ہیں۔

”اچھا تم سارے دروازے بند رکھو۔“ اس نے ماؤتھ پیس میں کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب وہ ان مقامات کے نمبر ڈائیل کرنے لگا جہاں سے کسی جگہ فریدی کی موجودگی کی اطلاع مل سکتی تھی۔ بہزار دقت ایک جگہ خود فریدی فون پر مل ہی گیا۔ حمید نے اسے قاسم کے بتائے ہوئے واقعہ سے مطلع کیا اور سلسلہ منقطع کر کے گیراج کی طرف بھاگا۔ ریو اور اس کی جیب ہی میں موجود تھا۔ کیونکہ آفس سے واپسی پر اس نے اب تک لباس نہیں تبدیل کیا تھا۔

بڑی جلدی میں اس نے اپنی کار گیراج سے نکالی اور قاسم کی کوٹھی کی طرف چل پڑا۔ لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ جلد از جلد وہاں پہنچ ہی جاتا۔ یہ شہر کی رونق کا وقت تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک کی بھیڑ بھاڑ تھی۔ جگہ جگہ خود کار سنگٹل راستہ روکے کھڑے نظر آئے۔ بہر حال وہ آدھے گھنٹے سے پہلے قاسم کے گھر تک نہ پہنچ سکا۔

لیکن یہاں تو اب سناٹا تھا ویسے لا تعداد سرخ ٹوپیاں کمپاؤنڈ میں نظر آرہی تھیں اور تین سرچ لائٹس کے علاوہ کمپاؤنڈ کے بلب بھی روشن تھے۔

متعدد لاشیں.... حمید پہلی نظر میں شمار نہ کر سکا۔ پھر جیسے ہی وہ کمپاؤنڈ میں داخل ہوا فریدی پر نظر پڑی جو بے سر کی لاشوں کے درمیان کھڑا ایس۔ پی ٹی سے گفتگو کر رہا تھا۔

پھاٹک کے باہر شائد پورا علاقہ امنڈ آیا ہو تا اگر پولیس نے پٹرول کاروں میں لگے ہوئے لاؤڈ سپیکروں کے ذریعہ سارے علاقے میں کرفیو کے نفاذ کا اعلان نہ کر دیا ہوتا۔ حمید کو ایک لاش بھی

ایسی نہ دکھائی دی جس کے شانوں پر سر موجود ہوتا۔ لباس وہی تھا، جو پچھلے دنوں وہ دوسری لاشوں پر دیکھ چکا تھا۔ حمید کا سر چکرا کر رہ گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرتا ہے۔ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔

فریدی نے اسے دیکھا اور اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

اس نے اسے ہدایت دی کہ وہ اندر جائے اور مس ڈھوکے کمرے میں موجود رہے، بیک وقت اتنی لاشیں دیکھ کر حمید بوکھلا گیا تھا اس لئے وہ بے چوں و چرا کوٹھی کی طرف مڑ گیا۔

اور پھر دوسری صبح اسے پچھلی رات کے سارے واقعات کسی بھی ایک خواب کی طرح یاد آ رہے تھے۔ وہ مس ڈھوکے کمرے میں تھا اور اس کی بگڑی ہوئی حالت اس کی نظروں میں تھی۔

اس کے علاوہ کمرے میں ایک نرس اور ایک ڈاکٹر بھی تھا۔ قاسم اور اس کی بیوی سے تو ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ خود انہوں نے اس سے ملنا پسند نہ کیا ہو۔ پھر رات ہی کو مس ڈھوکے فریدی کی کوٹھی میں لائی گئی تھی اور حمید نے گھر پہنچ کر اس کے چہرے پر بحالی دیکھی تھی۔ ایسا معلوم ہوا تھا جیسے اب اسے کسی بات کا خوف نہ رہ گیا ہو۔ مگر حمید اسے کینہ توڑ نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کس بلا کی اداکاری کرتی ہے۔ قاسم کی کوٹھی میں تو ایسا لگ رہا تھا جیسے صرف چند گھنٹوں کی مہمان ہو۔ لیکن اب.... سوچنا پڑتا ہے کہ اسے ہوا کیا تھا۔

دو بجے دن تک وہ یور ہو تا رہا کیونکہ آج فریدی اسے مس ڈھوکے نگہداشت کے لئے گھر ہی پر چھوڑ گیا تھا۔ تاکید تھی کہ مس ڈھوکے کو تنہا چھوڑا جائے۔ ویسے حمید ابھی تک اس کا اندازہ نہیں کر سکا تھا کہ فریدی کا رویہ اس عورت کے ساتھ حقیقتاً ہمدردانہ ہے یا وہ سب کچھ مصلحت کوئی کے تحت ہو رہا ہے.... کبھی کبھی خیال ضرور گذر تا تھا کہ فریدی اپنے ہمدردانہ برتاؤ میں مخلص نہیں ہے.... بلکہ اس نے بعض شبہات کی بناء پر اسے الجھا رکھا ہے۔

دو بجے فون کی گھنٹی بجی.... دوسری طرف سے فریدی بول رہا تھا۔ اس نے حمید کو اطلاع دی کہ وہ آدمی مل گیا ہے جس کی انہیں تلاش تھی۔

”اس کا نام صولت مرزا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور وہ ہوٹل ڈی فرانس کے کمرہ نمبر ستائیس میں مقیم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے چیک کرو۔ اپنی شخصیت چھپانے کی ضرورت نہیں۔“ ”مگر پھر.... ان محترمہ کی چوکیداری کون کرے گا۔“ حمید نے جھلنے کے سے انداز میں

پوچھا تھا۔

”فکر مت کرو.... اُن چاروں افغان ہاؤنڈ کو کمپاؤنڈ میں کھلا چھوڑ کر چلے جاؤ جو ہمیشہ بندھے رہتے ہیں۔ مگر پھانگ کھلانے رہنے پائے ورنہ وہ سارا شہر الٹ پلٹ کر رکھ دیں گے۔“

”کیا اس صولت مرزا کو حراست میں لے لوں۔“

”نہیں.... تم صرف مس ڈھوکے بارے میں اس سے پوچھ گچھ کرو گے۔ اسے تم یہ بتا سکتے ہو کہ مس ڈھوکے اس کے خلاف رپورٹ درج کرائی ہے کہ وہ اس سے خائف ہے۔“

گفتگو یہیں ختم ہو گئی تھی اور حمید سارے انتظامات مکمل کر کے ہوٹل ڈی فرانس کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کمرہ نمبر ستائیس کے دروازے پر دستک دی۔

دروازہ کھلا اور اس کے سامنے وہی آدمی موجود تھا جس کی تصویر منقار نے بنائی تھی۔ وہ یقیناً ایک وجیہہ اور دلکش آدمی تھا۔ اس میں صنفِ مقابل کیلئے یقینی طور پر بڑی سکس اپیل رہی ہوگی۔ ”فرمائیے جناب....!“ اس کا لہجہ بے حد شریفانہ تھا اور آواز نرم تھی۔

حمید نے سوچا کہ وہ کسی بُرے آدمی کا ایجنٹ تو ہو سکتا ہے لیکن خود بُرا نہیں ہو سکتا۔

اس نے اپنا تعارفی کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا اس نے اس پر نظر ڈالی اور حیرت سے حمید کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں نہیں سمجھ سکتا جناب کہ مجھے پولیس سے کیا سروکار ہو سکتا ہے۔“

”کیا آپ اندر چل کر بیٹھیں گے نہیں۔“ حمید مسکرایا۔

”اوہ.... معاف کیجئے گا۔ میں اکثر خالی الذہن ہو جاتا ہوں۔“ اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

حمید نے کمرے میں داخل ہو کر ایک کرسی سنبھال لی۔ اس کا رویہ کسی ریکورڈ آفیسر کا سا تھا.... اس نے دیدہ و دانستہ اس قسم کا رویہ اختیار کیا تھا۔

”ہاں.... تو فرمائیے.... جناب.... مجھے اس الجھن سے نجات دلائیے۔ میں ڈر اور پوک

قسم کا آدمی ہوں.... بچپن ہی سے پولیس میرے لئے ہوا رہی ہے۔“ اس نے میز کے ایک گوشے سے نکتے ہوئے کہا۔

”میں ایک عورت کی شکایت پر یہاں آیا ہوں۔“ حمید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے

کہا۔ ”اس کا کہنا ہے کہ آپ اسے پریشان کر رہے ہیں۔“

صولت مرزا نے متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکائیں۔ پھر یک بیک غصیلے لہجے میں بولا۔ ”آپ تشریف لے جائیں ورنہ پولیس کو فون کرتا ہوں۔ کیا آپ مجھے بالکل احسن سمجھتے ہیں۔ آپ جعلی پولیس آفیسر ہیں۔ میں آئے دن ایسے ٹھگوں کے متعلق اخبارات میں پڑھتا رہتا ہوں۔ آپ مجھ سے ایک پائی بھی نہیں وصول کر سکتے۔ اگر ہاتھ پائی کا ارادہ ہو تو اس سے بھی پیچھے نہیں ہٹوں گا۔“

”میں مس ڈھو کے متعلق گفتگو کر رہا ہوں۔ کہنے تو کسی باوردی آفیسر کو بھی طلب کر لوں۔“

”مس ڈھو۔“ صولت مرزا کا لہجہ پھر نرم پڑ گیا۔ لیکن اس بار اس میں استعجاب بھی شامل تھا۔ وہ چند لمحے متفکرانہ انداز میں حمید کی طرف دیکھتا ہوا پھر بولا۔ ”مگر مس ڈھو کو مجھ سے کیا شکایت ہو سکتی ہے جس کے لئے اسے پولیس کی مدد حاصل کرنی پڑے۔“

”اسے شکایت ہے کہ آپ اس سے شادی کرنے پر مصر ہیں۔“

”میرے خدا....!“ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”کیا یہ بھی کوئی جرم ہے یعنی کہ شادی کی درخواست کرنا.... کہیں میں حیرت کی زیادتی کی وجہ سے پاگل نہ ہو جاؤں جناب۔“

”وہ ایک بوڑھی اور انتہائی درجہ بد شکل عورت ہے مرزا صاحب! آپ اس کے مقابلے میں بہت کم عمر ہیں گو آپ کی آنکھیں کسی معمر آدمی کی آنکھوں کی سی گہرائی رکھتی ہیں لیکن مس ڈھو اور آپ میں زمین و آسمان کے فرق سے بھی کچھ زیادہ فرق ہے۔“

”یہ میرا قطعی نئی معاملہ ہے جناب۔ دنیا کی کسی بھی عدالت میں میرا مقدمہ پیش کیجئے اگر مجھے ایک دن کی بھی سزا مل سکی تو میں جج سے استدعا کروں گا کہ وہ مجھے پھانسی پر لٹکا دے۔ غضب خدا کا اب شادی کی درخواست کرنا بھی جرم قرار پا گیا ہے۔“

”واقعی یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس کے لئے حمید دوڑا آیا۔ اس کی عقل چکر اکر رہ گئی۔ لیکن اس نے جلد ہی سنبھالا لے کر کہا۔ ”ایسی بے جوڑ ٹیم آج تک میری نظروں سے نہیں گذری۔“

”معاف کیجئے گا آپ حد سے بڑھ رہے ہیں کیپٹن.... دنیا میں کوئی بھی مجھے اپنی پسند پر ٹوکنے کا حق نہیں رکھتا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے میرے دوست۔ مگر اس شادی کا انجام کیا ہوگا۔“ حمید کو خولہ خواہ مذاق کی سوجھی۔

”خدا کے لئے بس خاموش رہئے۔ آپ مجھے چڑچڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میری

عدالت خراب نہ کیجئے۔ میں دائمی خوش دلی کا قائل ہوں۔“ صولت مرزا نے بے بسی سے ہنستے ہوئے کہا۔

”مرزا صاحب آپ واقعی انتہائی حیرت انگیز آدمی ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ آپ کو دوست بناؤں۔“

”چلئے بن گیا دوست....!“ صولت مرزا نے ہنس کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ان کا مصافحہ گرم جوش اور طویل تھا۔

”اب ہم دوستانہ فضا میں گفتگو کریں گے۔“ حمید نے کہا۔ ”یہ حقیقت ہے کہ مس ڈھو آپ سے خائف ہے۔ میں نہیں جانتا کیوں؟ اسے تو خوش ہونا چاہئے کہ ایک دی بونز قسم کا آدمی اس پر عاشق ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جوانی میں بھی اسے کسی نے نہ پوچھا ہوگا۔“

”کیا وہ سچ خائف ہے کیپٹن....!“ صولت مرزا نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں دوست! اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں یہاں کیوں نظر آتا اور پھر آپ کو ڈھونڈ نکالنا آسان کام بھی تو نہیں تھا۔ وہ اتنی ہی خوفزدہ ہے کہ ہمیں تشویش ہوئی اور ہم اتنی درد ساری مول لینے پر آمادہ ہو سکے۔“

صولت مرزا خاموش ہو گیا اس کا چہرہ تو سپاٹ تھا۔ لیکن آنکھوں سے الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں خدوخال آنکھوں سے ہم آہنگ نہیں معلوم ہوتے تھے۔

”شاید میں کسی مصیبت میں پھنسنے والا ہوں۔“ وہ کچھ دیر بعد آہستہ سے بڑبڑایا اور حمید کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

”کیوں؟ کیا بات ہے۔“

”میں کہتا ہوں! آخر وہ خائف کیوں ہے۔ اب مجھے بھی سوچنا پڑا ہے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ اسے تو خوش ہونا چاہئے۔“

”مگر آپ مصیبت میں کیوں پھنسنے والے ہیں۔“

وہ پھر خاموش ہو گیا۔ حمید اس کی آنکھوں میں ذہنی کشمکش کی جھلکیاں دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب یہ آدمی کوئی ایسی بات اگلنے والا ہے جو صحیح معنوں میں اس کے نظریات کی تائید کرے گی۔ اس نے تھوڑی دیر بعد بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”ہم دوست ہو چکے ہیں نا کیپٹن....!“

”اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہ ہونی چاہئے۔“ حمید نے بے حد خلوص کا اظہار کیا۔

گئی۔ لیکن دو ہزار روپیوں کا خیال تھا اور کرنا بھی تھا محض عیش۔ آپ مجھے صرف سو روپے دیجئے
میں کسی بھینس سے عشق شروع کر دوں گا۔“

وہ ہنسنے لگا۔ حمید بھی اس جملے پر مسکرایا تھا۔ مگر اس کے اضطراب کا کیا پوچھنا جبکہ خود اس کا
ایک نظریہ بار آور ہوتا نظر آ رہا تھا۔
”وہ کون تھا.... نام اور پتہ بتاؤ۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ اسی شہر میں رہتا ہے۔ لیکن میرا دعویٰ ہے کہ اس نے کبھی اپنا نام اور
پتہ مجھے صحیح نہیں بتایا۔ صرف سر نیم سے واقف ہوں۔ وہ خود کو چنگیزی کہتا ہے۔ تنخواہ دینے کے
لئے فون پر کسی جگہ کا تعین کرتا ہے اور تنخواہ مجھے مل جاتی ہے۔ وہ خود ہی آتا ہے جب مجھے روپے
مل جاتے ہیں تو پھر میں کیوں اس چکر میں پڑوں کہ وہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ ویسے یہ اس کی
دمکی بھی ہے کہ اگر کبھی میرے متعلق چھان کرنے کی کوشش کی اور مجھے معلوم ہو گیا تو اس
ملازمت کو ختم سمجھنا۔ تنخواہ بند ہو جائے گی پھر بتائیے.... مجھے کیا پڑی ہے کہ اپنے پیروں پر
کھاڑی ماروں.... شہزادوں کی طرح عیش کر رہا ہوں۔ قدرتی بات ہے ناکپین.... یا میں غلط کہہ
رہا ہوں اور پھر ابھی تک اس نے مجھ سے کوئی غیر قانونی کام بھی نہیں لیا.... ایک بوڑھی اور
بد صورت عورت سے عشق.... ارے میں اس کی دواؤں سے بھی عشق کر سکتا ہوں۔ بشرطیکہ وہ
دو ہزار میں کچھ اور اضافہ کرنے پر تیار ہو جائے۔ مگر اب میں الجھن میں ہوں، وہ ڈرتی کیوں ہے!
اتنی خائف کیوں ہے کہ پولیس کی مدد حاصل کرنے کے لئے دوڑی گئی۔ یقیناً یہ کوئی بڑا چکر
ہے.... اور اخیر میں مجھے ہی پھانسی ہو جائے گی۔ وہ تو پردے میں ہے میں اسے کہاں ڈھونڈتا
ہوں گا۔“

ایک بیک صولت مرزا بہت زیادہ خوفزدہ نظر آنے لگا۔

”وہ ایک دبلا پتلا بوڑھا آدمی ہے۔“ صولت مرزا نے تھوڑی دیر بعد بھرائی ہوئی آواز میں
کہا ”صحت عمر کے لحاظ سے بہت اچھی ہے۔ سر بالکل شفاف ہے۔ آنکھیں چھوٹی اور اندر کو
دھنکی ہوئی ہیں۔ مگر ان میں وہ دھندلاہٹ نہیں ملتی جو معمر آدمی کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔“
حمید کو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے اس کے ذہن میں کسی موٹر سائیکل کا انجن کھل گیا ہو۔ یہ
طیرہ سو فیصدی سر جوزف کا تھا۔ اس کا اضطراب بڑھ گیا اور اس نے اپنے جوش پر قابو پانے کی

”میں حقیقتاً مصیبت میں پڑ گیا ہوں آج سے چھ ماہ پہلے میں ایک شاطر چور اور گرہ کٹ تھا۔
مجھے اپنی گرفتاری کی کبھی فکر نہیں ہوئی تھی۔ میں بے خوف ہو کر کام کرتا تھا۔ لیکن آج میرا دل
کانپ رہا ہے۔ میں کبھی گرفتار نہیں ہوں۔ لیکن آج ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں کسی بہت بڑے
جرم میں ماخوذ کیا جانے والا ہوں۔ جس کے سامنے چوری اور گرہ کٹی کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔“
”دل کا بوجھ ہلکا کر ڈالو.... دوست.... میں تمہیں دوست کہہ چکا ہوں۔ بہر حال میں خیال
رکھوں گا۔“ حمید نے بڑی گرم جوشی سے کہا۔

وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”آج سے چھ ماہ پہلے کی بات ہے کہ میں تیز گام کے
ایک ایئر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ میں سفر کر رہا تھا۔ اس سفر کی وجہ ایک مالدار آدمی بنا تھا جس کے پاس
بڑے نوٹوں کی کئی موٹی موٹی گڈیاں تھیں۔ کمپارٹمنٹ میں صرف ہم دو ہی آدمی تھے۔ سفر لمبا
تھا۔ ہمیں یہیں آنا تھا۔ اس لئے ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے اور پھر مجھے تو بے تکلف
ہو جانے میں ملکہ حاصل ہے۔ لیکن رات کو میں نے اس کے سوٹ کیس پر ہاتھ صاف کر دیا۔ مجھے
یقین تھا کہ وہ گہری نیند سو رہا ہے۔ جیسے ہی میں گڈیاں سمیٹ کر مڑا میرا سر ہوا میں اڑ گیا۔ کیونکہ
وہ تھوڑے ہی فاصلے پر ریو اور تانے کھڑا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک سفاک سی مسکراہٹ
تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں نوٹوں کی گڈیاں سوٹ کیس میں رکھ کر وہاں سے ہٹ جاؤں۔
میں صرف چور تھا کپتان صاحب دھول دھپے سے گھبرا تا تھا۔ میں نے چپ چاپ اس کے حکم کی
تعمیل کی۔ اب اس نے مجھے اپنی جگہ بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ میں نے پھر تعمیل ہی کرنے میں عافیت
سمجھی۔ وہ ریو اور کارخ میری طرف کئے ہوئے سوٹ کیس کی طرف گیا اور اس میں سے دو گڈیاں
نکال کر میری طرف اچھال دیں اور بولا انہیں رکھو۔ تمہیں روپیوں کی ضرورت ہے۔ میں بوکھلا
گیا کیپٹن کیا یہ حیرت انگیز واقعہ نہیں تھا۔ غرضیکہ اس نے کچھ اس انداز میں اصرار کیا کہ مجھے وہ
پانچ ہزار روپے رکھنے ہی پڑے۔ بڑی رقم ہوتی ہے جناب۔ پھر اس نے معاملہ کی گفتگو شروع
کر دی۔ وہ مجھے دو ہزار ماہوار پر ملازم رکھنا چاہتا تھا۔ میں تیار ہو گیا۔ کیونکہ کام کی نوعیت عیش
کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی۔ مجھے ہوٹل ڈی فرانس میں قیام کرنا تھا اور کہا گیا تھا کہ کام کے
وقت کام بتا دیا جائے گا۔ پانچ ماہ تک میں صرف عیش کرتا رہا۔ پھر مجھ سے کہا گیا کہ میں مس ڈھو
سے عشق کروں اور شادی کی خواہش ظاہر کروں۔ مس ڈھو کو میں نے دیکھا اور میری روح لرز

کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اب وہ تمہیں کب اور کہاں ملے گا۔“

”فی الحال تو کوئی پروگرام نہیں ہے۔ لیکن وہ غیر متوقع طور پر ہی فون کرتا ہے۔ اگر کوئی پروگرام بنا تو میں آپ کو ضرور مطلع کروں گا خدا را مجھے اس جنجال سے نجات دلائیے میں اپنے جرائم کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں لیکن جس دوام خدا کی پناہ۔“

”تم فکر مت کرو۔ یہاں اب چار آدمی ہر وقت تمہاری نگرانی کریں گے۔ اگر تم نے ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی تو نتیجہ کی ذمہ داری خود تم پر ہوگی۔ ہم پولیس والے بہت جلد کسی بات پر یقین کر لینے کے عادی نہیں ہوتے۔ جب تک کہ میں اس آدمی کو حقیقتاً نہ پکڑ لوں تمہاری طرف سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایسی کہانیاں تو ہم دن رات سنتے رہتے ہیں۔“

”آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے جناب۔ چار نہیں چار ہزار آدمیوں سے نگرانی کرائیے۔“

حمید نے اُسے گھر اور آفس کے فون نمبر لکھوائے اور نیچے ڈاننگ ہال میں آیا یہاں سے اپنے چار ماتحتوں کو فون کئے جنہیں صولت مرزا کی نگرانی کرنی تھی اور اس وقت تک وہیں ٹھہرا رہا جب تک کہ ان چاروں نے وہاں پہنچ کر اپنی اپنی پوزیشن نہیں لے لی۔

اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ فریدی کے قول کے مطابق اب یہ کیس خود اسی کا ثابت ہونے والا ہے۔ کیونکہ سر جوزف والے نظریہ سے فریدی متفق تو ضرور تھا لیکن اُسے محض مفروضہ قرار دیتا تھا۔

چراغ

”ہمیں کتنی دور جانا ہو گا مسٹر صولت مرزا“ فریدی نے پوچھا۔

”دیکھئے!“ صولت مرزا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”اس جگہ اس نے مجھے پہلی بار طلب کیا ہے۔ بس نشان چراغ ہے پینیل کے درخت کے پاس ہی کہیں نہ کہیں روشنی نظر آئے گی۔ روشنی نظر آنے کے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ وہاں پہنچے گا۔“

”اس علاقے میں شاید کوئی بہت بڑا پینیل کا درخت ہے اسی کے ساتھ پختہ کنواں بھی ہے کیوں؟“ فریدی نے حمید کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہاں شاید ہے تو“ حمید نے جواب دیا۔

”مگر مسٹر صولت مرزا اگر وہ آدمی بہت زیادہ محتاط نکلا تو کیا ہو گا۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ“

آپ کی نگرانی بھی کراتا رہا ہو۔ اگر وہ کسی بڑے چلو میں ہوا تو یقین رکھئے کہ اس نے آپ پر بالکل ہی اعتماد نہ کر لیا ہو گا۔“

”پھر بتائیے میں کیا کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد یہ مسئلہ صاف ہو جائے۔ میں زیادہ دیر تک الجھنوں میں رہنے کی سکت نہیں رکھتا۔“

”ہوں اوں سوچنا پڑے گا اچھا!“ فریدی نے شکرانہ انداز میں کہا اور گھڑی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”ابھی تو کافی وقت ہے۔“

پھر اس نے ایک سگار سلگایا اور کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔ اس وقت رات کے سات بج رہے تھے۔

پچھلے دن سے اس وقت تک حمید نے صولت مرزا کی نگرانی کرائی تھی اور آج شام کو چار بجے صولت مرزا نے اسے فون پر اطلاع دی تھی کہ آج ہی پروگرام بن گیا ہے۔ اس لئے وہ چھ بجے تک ہوٹل ڈی فرانس پہنچ جائے لہذا آج حمید اکیلے نہیں آیا تھا۔ اس کے ساتھ فریدی بھی تھا۔

فریدی نے صولت مرزا کے متعلق حمید کی رپورٹ سن کر اتنا کہا تھا۔ ”چلو میرا نظریہ شکست ہو گیا۔ مگر مجھے اس کا غم نہیں ہے کیونکہ یہ کیس میں پہلے ہی تمہارے سپرد کر چکا تھا۔“

حمید نے اس خبر پر بغلیں تو کیا بجائی تھیں البتہ سر ضرور پیٹا تھا یہ سوچ کر اب اگر اسی طرح کیس سپرد کرنے کا سلسلہ ہی چل پڑا تو کیا ہو گا۔ وہ تو کہیں کا نہ رہے گا۔

مس ڈھو آج بھی نارمل رہی تھی اور کوئی خاص واقعہ بھی پیش نہ آیا تھا۔

اب اس وقت صولت مرزا اور وہ دونوں بیٹھے سوچ رہے تھے کہ مجرم پر کس طرح ہاتھ ڈالا جائے۔ تھوڑی دیر بعد فریدی نے کہا۔ ”میری دانست میں اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں رہ جاتی مسٹر صولت مرزا کہ ہم ہی رسک لیں۔ میں دراصل مجرم کو موقع ہی پر پکڑنا چاہتا ہوں۔ ورنہ وہ تو میری جب میں رکھا ہوا ہے۔ اگر اس وقت وہ ہاتھ نہ آیا تو کل میں خود ہی اسے پکڑ کر آپ کے سامنے لاؤں گا اور آپ اسے شناخت کریں گے۔“

”تو پھر آپ یہی کیوں نہیں کرتے۔“ صولت مرزا نے خوش ہو کر کہا۔ ”خواہ مخواہ خطرات

میں پڑنے سے کیا فائدہ وہ مجھے بے حد خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے۔“

”میں تو اسے آپ سے گفتگو کرتے ہوئے پکڑنا چاہتا ہوں۔“ فریدی نے کہہ کر سگار کا ایک طویل کش لیا اور پھر اسے الٹش ٹرے میں رگڑتا ہوا بولا۔ ”اب اٹھنا چاہئے۔“

وہ دونوں بھی کھڑے ہو گئے اور فریدی نے کہا۔ ”تو پھر ہم لوگ لینڈ کسٹمز پورٹ تک گاڑی سے چلیں اور گاڑی وہیں چھوڑ دی جائے۔ وہاں سے پیدل چلنا ہی مناسب ہو گا۔ مسٹر مرزا کیا خیال ہے۔ اس طرح ہمیں اس کا بھی اندازہ ہو سکے گا کہ ہمارا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا۔“

”بہت مناسب تجویز ہے جناب۔“ صولت مرزا پھر خوش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے فکر مندی کے بادل چھٹ گئے تھے۔

لینڈ کسٹمز پورٹ تک وہ لوگ جیب سے آئے اور فریدی نے جیب پوسٹ کے احاطے میں کھڑی کر دی۔ یہاں کے سارے ہی چوکیدار کرٹل فریدی اور کیپٹن حمید کو بخوبی پہچانتے تھے اس لئے جیب وہاں چھوڑی جاسکتی تھی۔

اس عمارت کے بعد پھر دور دور تک کسی عمارت کا پتہ نہیں تھا۔ سڑک کے دونوں جانب جنگل بکھرے ہوئے تھے۔ تقریباً نصف میل پیدل چلنے کے وہ بائیں جانب ایک گنڈنڈی پر اتر گئے۔

”مجھے یقین ہے جناب۔“ دفعتاً صولت مرزا بولا۔ ”کہ ہمارا تعاقب نہیں کیا جا رہا۔“

”ہاں مجھے بھی اطمینان ہو گیا ہے۔“ فریدی نے جواب دیا اور پھر وہ خاموشی سے راستہ طے کرنے لگے۔ بلاآخر وہ اس جگہ پہنچے جہاں ایک پرانا اور پختہ کنواں بھی تھا اور پیپل کا ایک جٹا وھاری اور کہن سال درخت بھی۔

”اوہ.... میرے خدا میں تو اس اندھیرے میں سمتوں کا تعین نہیں کر سکتا۔ اس نے کہا تھا کہ وہاں پہنچ کر شمال کی جانب نظر رکھی جائے۔ ادھر ہی کہیں روشنی نظر آئے گی اور روشنی نظر آنے کے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد مجھے وہیں پہنچ جانا چاہئے جہاں روشنی نظر آئے۔“ صولت مرزا نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔

”یہ رہا شمال۔“ فریدی نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر ایک جانب سر گھمادیا اور صولت مرزا خوفزدہ سے انداز میں ہنسنے لگا۔ سردی مزاج پوچھ رہی تھی۔ فریدی اور حمید نے سیاحوں کا سا ادنیٰ اور چرمی لباس پہن رکھا تھا۔ لیکن صولت مرزا معمولی سے سوٹ ہی میں تھا۔

ٹھوڑی دیر بعد بچ بچ انہیں شمال میں کچھ فاصلے پر ہلکی سی روشنی نظر آئی جو حمید کی دانست

میں زمین کی سطح سے زیادہ اونچی نہیں تھی۔

”اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔“ صولت مرزا بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”آدھے گھنٹے بعد وہاں پہنچ جائیے گا.... اور ہم تو اب چلے۔“ فریدی نے کہا۔

”کک.... کہاں....“ صولت مرزا ہکلیا۔ لیکن فریدی کوئی جواب دیے بغیر حمید کو

اندھیرے میں ایک جانب کھینچتا لیتا چلا گیا۔

شاید پندرہ منٹ تک وہ اندھیرے میں بھٹکتے رہے۔ حمید کو اب وہ روشنی بھی نہیں نظر آرہی تھی۔ ایک جگہ فریدی نے اسے زمین پر سینے کے بل لیٹ جانے کو کہا اور حمید نے بڑا سامنہ بنائے ہوئے تعمیل کی۔ یہاں غنیمت یہی تھی کہ جھاڑیاں نہیں تھیں، نسبتاً صاف ستھری زمین تھی ورنہ سانپوں کے خوف سے حمید کی گھگھسی بندھ جاتی۔ اندھیرے میں سانپ کا خوف اس کی ایک بہت بڑی کمزوری تھی اور وہ بچپن سے اب تک اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا۔

اب وہ سینے کے بل کھکتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ دفعتاً وہ روشنی حمید کو پھر نظر آئی جو اب زیادہ دور نہیں تھی۔ معمولی سی جدوجہد اس تک پہنچا سکتی تھی۔ یہ روشنی ایک دائرے کی شکل میں نظر آرہی تھی۔ حمید کو تو ایسا لگا تھا جیسے کسی گڑھے میں چراغ روشن ہو۔ اس نے گھڑی کے اندھیرے میں چپکنے والے ڈائیکل پر نظریں جمادیں۔ وہ بیس منٹ کے اندر اندر اس روشنی تک پہنچے تھے۔ حقیقتاً ایک چھوٹے سے گڑھے ہی میں چراغ روشن تھا! وہ گڑھے کے قریب پہنچ گئے تھے۔ روشنی کی لو.... ایک سنگی سے نکل رہی تھی اور وہ کاربائیڈ کا چراغ معلوم ہوتا تھا لیکن اس سے خارج ہونے والی بو ناخوشگوار تھی۔ حمید کا سر چکرانے لگا۔

”یہ بدبو کیسی ہے....“ اس نے آہستہ سے کہا اور فریدی کی طرف دیکھا۔

مگر فریدی.... وہ کہاں تھا۔ حمید بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مگر اس معمولی سی روشنی کے پھیلاؤ میں تو وہ کہیں نہ دکھائی دیا۔ حمید نے اٹھنا چاہا.... لیکن سارا جسم کانپ کر رہ گیا.... سر شدت سے چکر لیا تھا.... پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ اسے ہوش ہی نہ رہ گیا.... اندھیرے میں اندھیرے کا احساس بھی تحلیل ہو کر رہ گیا تھا۔

اور جب ہوش آیا تو.... بقول حاتم طائی نہ وہ صحرا تھا اور نہ وہ چراغ زیر زمین بلکہ یہاں تو چراغ چھت سے الٹے لٹک رہے تھے۔ اس لئے چراغوں تلے اجالا بھی تھا جو کم از کم حاتم طائی کے

زمانے میں تو کسی طرح بھی ممکن نہ ہوتا۔

ہاں تو وہ ایک روشن کمرے میں چٹ پڑا ہوا تھا اور فریدی گھٹنوں کے بل بیٹھا نظر آیا۔ اس پوزیشن میں کہ اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ ذرا اور گردن گھمائی تو دیکھا کہ صولت مرزا ایک ریوالور سنبھالے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ ریوالور کا رخ فریدی کے سینے کی طرف تھا۔ صولت مرزا کے پیچھے دو آدمی مؤدب کھڑے تھے۔ یہ سفید فام تھے لیکن صورت ہی سے خطرناک معلوم ہو رہے تھے۔ حمید بھی اٹھ بیٹھا۔

”تم بھی اسی پوزیشن میں آ جاؤ دوست....!“ صولت مرزا نے نرم لہجے میں کہا۔
”تو تم نے دھوکا دیا۔“ حمید دانت پیس کر بولا۔

”کیوں برخودار....!“ فریدی نے تلخ سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ”میں نہ کہتا تھا کہ تمہارا نظریہ غلط ہے! سر جوزف جیسے بدھو عاشق اتنے ذہین نہیں ہو سکتے۔ دیکھو! میرا نظریہ ہی بار آور ہوا ہے۔“

”تمہارا نظریہ کیا تھا کرل فریدی۔“ اس بار بھی صولت کا لہجہ نرم ہی تھا۔

”یہی کہ ڈاکٹر دو بے زندہ ہے اور وہ خود ہی اتنی موتوں کا ذمہ دار ہے۔ کیا میں اتنی عقل نہیں رکھتا کہ دھماکے ان کی کھوپڑیاں کیوں اڑا دیتے تھے۔“
”اگر زندہ ہے تو بتاؤ وہ کہاں ہے۔“ صولت مرزا مسکرایا۔ ”اس دوران میں تو نہ جانے کتنے ڈاکٹر دو بے پیدا ہوئے اور فنا ہو گئے۔“

”ڈاکٹر دو بے.... میرے سامنے موجود ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کا ریوالور ہمیں آسمان نہ دیکھنے دے گا۔“

”خوب....!“ صولت مرزا مسکرایا۔ ”کیا ڈاکٹر دو بے اتنا ہی حسین تھا۔“

”گھٹیا بات ڈاکٹر دو بے۔“ فریدی بڑا سامنے بنا کر بولا۔ ”کوئی اور تذکرہ چھیڑو ایسی گھٹیا قسم کی سنسنی خیزیاں میرے لئے کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔“

”کیا مطلب....!“

”تمہارا موجودہ حسن پلاسٹک سرجری کا نتیجہ ہے.... ذرا اپنے بھدے ہاتھ پیر اور بے ڈھنگا جسم بھی دیکھو۔“

”خاموش....!“ دفعتاً صولت مرزا گر جا۔ ”میں انہیں بھدے اور بد شکل ہاتھوں سے تجھے ڈاکٹر دو بے بنا کر مرنے کے لئے شہر نہیں چھوڑ دوں گا۔“

فریدی نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”تم اپنی بد صورتی کے تذکرے پر بھڑ جاتے ہو۔ ہونا آخر ڈاکٹر دو بے۔“

”ہاں.... میں ساری دنیا کو تباہ کرنے کا منصوبہ تیار کر چکا ہوں۔ میں ایک ہفتے میں تمہیں دیو بنا سکتا ہوں۔ تمہارے چہرے پر عمل جراحی کر کے تمہیں دنیا کا بد صورت ترین آدمی بنا سکتا ہوں۔ تم بہت دلکش ہو.... عورتیں تمہارے پیچھے دوڑتی ہوں گی۔ میں تمہارا چہرہ ضرور تباہ کروں گا۔“

”تم ایسے ہی درندے ہو! میں جانتا ہوں۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔ ”مگر تم نے مس ڈھو کو کیوں چھیڑا تھا۔ اسی کی وجہ سے تم بلا آخر روشنی میں آ گئے۔“

”وہ.... وہ.... میں اسے چاہتا ہوں۔ کبھی اس پر اتنا غصہ آیا تھا کہ اسے زندہ جلادینے سے گریز نہیں کیا تھا۔ لیکن یہاں واپس آنے پر جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ زندہ ہے تو میں بے چین ہو گیا کیونکہ مجھے اپنی زندگی میں وہ پہلی مخلص عورت ملی تھی۔ اسے مجھ سے خلوص تھا لیکن میری بد صورتی سے متفرق تھی۔ حالانکہ خود بھی بد صورت تھی۔ وہ مجھے بحیثیت شوہر نہیں پسند کر سکتی تھی۔ میں نے اسے اپنی دانست میں زندہ جلادیا۔ لیکن پھر اس کی یاد میں برسوں رویا ہوں۔ پہلے وہ مجھ سے اس لئے بھاگی تھی کہ میں بد صورت تھا اب اس لئے خائف ہو گئی کہ میں بہت خوبصورت ہوں.... میرے خدا میں کیا کروں.... میں کیا کروں.... یہ کتنی بڑی بد نصیبی ہے.... میں دنیا کے سارے چہرے تباہ کر دوں گا.... میں قدرت سے انتقام لے رہا ہوں سمجھے۔ دنیا کے ایک ایک فرد کو ڈاکٹر دو بے بنادوں گا.... کرو مجھ سے نفرت.... مجھے حقیر.... سمجھو.... ایک دن تم مجھے سجدہ کرو گے.... ابن مقفع یاد ہے تمہیں یا نہیں۔ جس نے ماہ ٹمب بنایا تھا۔ وہی لوگ جو اس کی بد صورتی کی وجہ سے اس سے نفرت کرتے تھے اسے سجدہ کرنے لگے تھے۔ اس نے اپنے چہرے پر نقاب ڈالی تھی اپنے پرستاروں سے کہا کرتا تھا کہ وہ اس کے حسن کی تاب نہ لا سکیں گے۔ اس لئے وہ انہیں اپنا چہرہ نہیں دکھاتا تھا.... ہاں.... میں نے تم سب سے انتقام لینے کے لئے بڑی محنت کی ہے۔ اور تم مجھے ضرور سجدہ کرو گے.... میں یہاں سے بھاگ کر جرمنی گیا تھا.... وہاں میں نے

پلاسٹک سرجری میں کمال حاصل کیا۔ جس سے یہ فن سیکھا تھا اسی نے میرے چہرے پر عمل جراحی کر کے مجھے حسین بنایا۔ مجھے جرمنی کی شہریت دلوائی۔ میں نے جنگ میں نازیوں کی شاندار خدمات انجام دیں اور ان کی شکست کے بعد بھی بری حالت میں نہیں رہا۔ آج میں مغربی جرمنی کے بہت بڑے ڈاکٹروں میں شمار کیا جاتا ہوں۔ آج سے چھ ماہ پہلے میں ان ڈاکٹروں کے ساتھ یہاں آیا تھا جو مغربی جرمنی سے سرکاری طور پر یہاں طب یونانی اور آیورویدک میں ریسرچ کرنے آئے ہیں۔ میں نے یہاں ایک خفیہ تجربہ گاہ بنا ڈالی کیونکہ یہاں سر جوزف جیسے سو موجود تھے جن سے مجھے انتقام لینا تھا۔ سالہا سال بعد ایک بار پھر میں نے حیوانات کی جسامت بڑھانے والے تجربات شروع کر دیئے۔ سڑکوں سے اپانچ فقیر اٹھائے اور انہیں دیو بنادیا۔ پلاسٹک سرجری کے ذریعہ انہیں ڈاکٹر بنایا۔ اور ڈاکٹر دو بے کو اذیتیں دینے والے سور کانپ اٹھے۔ سر جوزف جیسے لوگوں کا انجام بڑا بھیانک ہو گا کرمل فریدی۔ میں انہیں ان کے ہی ہاتھوں زہر پینے پر مجبور کر دوں گا۔ میں مس ڈھو کو چاہتا بھی ہوں اور اس لئے بھی اسے حاصل کرنا چاہتا تھا کہ وہ میرے اس حیرت انگیز تجربے سے واقف تھی، لہذا یہ ضروری تھا کہ ان دیوؤں کو منظر عام پر لانے سے پہلے اسے قابو میں کر لوں۔ میں چاہتا تو اسے قتل بھی کر سکتا تھا۔ مگر میں نے اسے پسند نہیں کیا۔ میں نے چاہا تھا کہ وہ دم دلا سے میرے قابو میں آجائے گی اور یہ جانے بغیر کہ میں ڈاکٹر دو بے ہی ہوں اپنی زبان بند رکھے۔ مگر جب وہ تمہارے پاس دوڑی گئی تو مجھے غصہ آگیا۔ ویسا ہی غصہ جیسا ایک بار پہلے بھی اس پر آچکا ہے۔ جس کے نتیجے میں خود مجھے بھی جل مرنا پڑا تھا۔ بہر حال غصے کا انجام یہ ہوا کہ میرے دیو قبل از وقت ہی منظر عام پر آگئے جس پر اب افسوس ہے۔

”مگر وہ جو ایک آدھ جلی لاش برآمد ہوئی تھی۔“ حمید نے اسے ٹوکا۔

”وہ میری تجربہ گاہ کا ایک آدمی تھا جس پر میں جانوروں کے بعد تجربہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔“

”کیوں۔۔۔ میں نے کیا کہا تھا۔“ فریدی حمید کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

”مگر کرمل تم اس طرح مطمئن نظر آرہے ہو جیسے میں تمہیں معاف کر دوں گا۔“ ڈاکٹر نے

طنزیہ لہجے میں کہا۔

”تم اس کی پرواہ مت کرو۔ تمہاری کہانی بہت دلچسپ ہے۔ مگر تمہارا جرمن نام کیا ہے۔“

”میں نے اپنے لئے روسی نام پسند کیا تھا۔ مایو کوئوف۔۔۔ اور اسی نام سے یہاں بھی آیا ہوں۔ یہ دونوں جرمن میرے بہترین رفیق اور راز دار ہیں یہ ابھی تم دونوں کو دوا انجکشن دیں گے جن کے اثر سے تم یہ محسوس کرو گے جیسے تمہارے جسم میں جان ہی نہ رہ گئی ہو۔ تم زندہ رہو گے لیکن اپنے جسم کو جنبش دینے کے لئے ترسو گے۔ لیکن ساتھ ہی تم یہ بھی بھولتے جاؤ گے کہ تم کرمل فریدی یا کیپٹن حمید ہو۔ اس کے بعد میں پلاسٹک سرجری کے ذریعہ تمہارا چہرہ بدل کر تمہیں ڈاکٹر دو بے بنادوں گا اور تم میرے اشاروں پر ناپنے لگو گے۔ میں تمہیں حکم دوں گا کہ فلاں جگہ جاؤ فلاں کو ڈراؤ۔۔۔ جب لوگوں میں گھر جاؤ اور پکڑ لئے جانے کا ڈر ہو تو اپنا سر زمین پر دے مارو۔۔۔ تم اس کے خلاف نہیں کرو گے۔ پھر زمین پر سر دے مارنے کا انجام تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔۔۔ ان پر گولی چلنے کے انجام سے بھی ناواقف نہیں ہو۔ دھماکے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ سر غائب ہو جائے اور کسی کو یہ نہ معلوم ہو سکے کہ وہ پلاسٹک سرجری کا کمال تھا۔ کیا سمجھے۔“

فریدی نے پھر حمید کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ دم بخود تھا۔

”مگر ڈاکٹر۔۔۔ وہ برقی رو کیسی تھی، جو ریوالور کی گولی کا رخ بھی پھیر دیتی تھی۔“

”اسے ابھی ہم کوئی نام نہیں دے سکے۔ اس قوت کا استعمال ابھی ابتدائی تجرباتی دور میں ہے۔ میں نے اس سے یہ کام لے ڈالا۔ اس کی طرف جتنی قوت کے کوئی چیز بھیجی جاتی ہے وہ اسے اتنی قوت سے واپس کر دیتی ہے۔ میں نے اسی رد عمل سے کام لیا ہے۔ رد عمل کے اثرات ایک چھوٹے سے محدود طاقت والے بم تک پہنچتے ہیں اور اسے پھاڑ کر صرف کھوپڑی کا صفایا کر دیتے ہیں۔ برقی قوت پیدا کرنے والی مشین اور بم ایک ہی ڈھانچے میں فٹ ہوتے ہیں اور وہ چھوٹا سا ڈھانچہ بڑے بالوں والی ٹوپی کے اندر ہوتا ہے کیا سمجھے۔۔۔ کرمل۔۔۔ جرمنی ایک بار پھر جنگ کے میدان میں آئے گا اور اس جنگ میں میرے دیوؤں اور اس حیرت انگیز برقی قوت سے کام لیا جائے گا۔ کیا سمجھے۔“

یہ دونوں کچھ نہ بولے۔۔۔ ڈاکٹر دو بے نے اپنے دونوں ساتھیوں سے جرمن میں کچھ کہا اور وہ دونوں آگے بڑھے۔ ایک کے ہاتھ میں دوا انجکٹ کرنے کی سرینج تھیں اور دوسرا خالی ہاتھ تھا۔ سرینج والا حمید کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ فریدی نے دوسرے آدمی پر چھلانگ لگائی۔۔۔ ساتھ ہی ایک فائر ہوا اور ایک چیخ بلند ہوئی۔ لیکن یہ چیخ ڈاکٹر کے جرمن ساتھی کی تھی۔

حمید نے دوسرے کو ڈھال بنانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ خطرناک ثابت ہوا۔ اس نے سرخ تو پھینک دی اور حمید سے لپٹ پڑا۔ دوسری طرف ایک فائر پھر ہوا۔ اب حمید نے دیکھا کہ فریدی ڈاکٹر دو بے سے گتھا ہوا ہے اور کوشش کر رہا ہے کہ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھین لے۔

ادھر ڈاکٹر کا ساتھی اسے رگڑے ڈال رہا تھا۔۔۔۔۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ حمید نے ہوش میں آنے کے بعد سے اب تک بے تماشہ کمزوری محسوس کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ چراغ سے خارج ہونے والی نشی گیس ہی کا اثر رہا ہو۔ بہر حال حریف سے لپٹ پڑنے کا فعل قطعی اضطراری تھا جس کے لئے وہ اب بھگت ہی رہا تھا۔

اچانک ایک فائر پھر ہوا۔۔۔۔۔ اس بار چیخ بڑی کر یہہ تھی۔۔۔۔۔ حمید بوکھلا گیا۔ کیونکہ اس کی پشت ان دونوں کی طرف تھی اور وہ آواز نہیں پہچان سکا تھا۔ وہ دیکھنے کے لئے مڑا ہی تھا کہ اس کے طاقت ور حریف نے اسے سر سے اونچا اٹھالیا۔۔۔۔۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں وہ فریدی کے بازوؤں میں تھا۔ اگر فریدی بروقت ہوشیار نہ ہو گیا ہوتا تو حمید کی ہڈیاں پلپٹیاں ایک ہو جاتیں۔ وہ اسے ایک طرف ڈال کر جرمن پر ٹوٹ پڑا۔ حمید اٹھا اور دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر دو بے کی لاش ابھی پھڑک ہی رہی تھی۔ وہ اس طرح ہاتھ پھیلا پھیلا کر بچے سکوڑ رہا تھا جیسے فرش کو نوچ ڈالنا چاہتا ہو۔

اب وہ تیسری چیخ سن کر پھر فریدی کی طرف متوجہ ہوا جو حریف کے سینے پر سوار اس کی گردن دبا رہا تھا۔۔۔۔۔ اس طویل چیخ کے بعد کمرے کی فضا پر بو جھل سا سکوت طاری ہو گیا۔ بیہوش جرمن کا سینہ کسی چمڑے کی دھونکی کی طرح پھول چمک رہا تھا اور وہ دونوں تو کبھی کے ختم ہو چکے تھے۔

فریدی خاموش کھڑا ڈاکٹر کی لاش کو گھورتا رہا۔

”مجھے اس کے انجام پر بے حد افسوس ہے حمید۔“ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”آدمی کی حیوانیت ہی اس انجام کا باعث بنی ہے۔ کاش اسے پاگل نہ بنایا گیا ہوتا۔ اس سے نوع انسانی کا درخشاں مستقبل وابستہ تھا۔ لیکن آدمی نے خود ہی اپنا مستقبل تاریک کر لیا۔ وہ۔۔۔۔۔ حمید دیکھو تو۔۔۔۔۔ کیا یہ دنیا کا بہترین دماغ نہیں تھا۔ اگر یہ پاگل نہ ہو گیا ہوتا تو۔۔۔۔۔ آدمی کی مشکلیں آسان کرنے کے لئے کتنی راہیں نکالتا۔ لوگ اس سے محض اس لئے نفرت کرتے رہے کہ یہ بد صورت تھا۔۔۔۔۔ چلو نفرت کر لیتے مگر کیا اس کا اظہار کرنا ضروری تھا۔۔۔۔۔ اور پھر تمہیں کب حق پہنچتا ہے

خدا کی بنائی ہوئی شکلوں سے نفرت ظاہر کرو۔ جب کہ تم ان سے بدترین بھی بنانے پر قادر نہیں ہو۔ آدمی نے خود ہی اپنی زندگی میں زہر بھرا ہے اور خود ہی تریاق کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ وہ خدا تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اپنے پڑوسی تک بھی اس کی پہنچ نہیں ہے۔ پڑوسی سے اس لئے متفرق ہے کہ وہ بد شکل ہے۔ حسن ازل سے آنکھیں سینکنا چاہتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن وہ اندھا ہے۔۔۔۔۔ اگر اسے بد صورتی ہی میں وہ جلوہ نہیں نظر آتا جس کی اسے تلاش ہے۔۔۔۔۔ یا خدا۔۔۔۔۔ آدمی کو عقل دے۔۔۔۔۔ انسانیت کا مستقبل محفوظ کر۔“



دوسرے دن ماہرین نے تصدیق کر دی کہ صولت مرزا کا چہرہ پلاسٹک سرجری ہی کا کارنامہ تھا۔۔۔۔۔ اس کے جرمن ساتھیوں میں سے جو زندہ بچا تھا اس نے خفیہ تجربہ گاہ کا پتہ بتایا لیکن وہاں سے مختلف قسم کی ادویات چھوٹے چھوٹے بھوں اور باریک تاروں کے ذخیرہ کے علاوہ اور کچھ بھی نہ برآمد ہو سکا۔ جن آدمیوں پر تجربات کئے گئے تھے۔۔۔۔۔ انہیں پہلے ہی ختم کر دیا گیا تھا۔

حمید کے استفسار پر فریدی نے بتایا کہ وہ پچھلی رات اس چراغ کے پاس سے اسی لئے کھسک گیا تھا کہ اسے اس کی بو خطرناک معلوم ہوئی تھی لیکن وہ پھر واپس ہوا تھا اور اسے بیہوش پا کر خود بھی سانس روک کر وہیں پڑ رہا تھا۔ اس طرح وہ بیہوش ہونے سے محفوظ رہ سکا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد انہیں وہاں سے اٹھا کر ایک بند گاڑی میں ڈال دیا گیا تھا۔ یہاں چونکہ بیہوش ہونے کا خدشہ باقی نہیں رہا تھا اس لئے اس نے سانس بھی لینی شروع کر دی تھیں لیکن بیہوش تب بھی بنا رہا تھا۔ بہر حال سانس روکنے کا فن ہی آئے آتا تھا، ورنہ شاید ڈاکٹر دو بے ہی کی اسکیم بار آور ہوتی اور وہ دونوں بحالت دیوانگی فنا ہو جاتے۔

فریدی نے یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر خود اپنی ہی گولی کا شکار ہوا تھا۔

مس ڈھو اور سر جوزف آج بھی زندہ ہیں یہ اور بات ہے کہ مردوں سے بھی بدتر ہوں۔

قاسم نے پھر کبھی لیڈی سیکریٹری کی تمنا نہیں کی۔!

ختم شد